ہم آپ

از

مولانا عبدالماجد دریابادی

۱۹۴۸ء

ہندستانی اکیڈیمی، یو پی، الہ آباد

ہم آپ

"پاپولر سائکالوجی" یعنی روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والا
نفسیات پر ایک عام فہم رسالہ

از

مولانا عبدالماجد دریابادی (بی اے)
مصنف فلسفۂ جذبات، مبادی فلسفہ وغیرہ

۱۹۴۸ء
ہندستانی اکیڈمی یوپی، الہ آباد

فہرست مضامین

دیباچہ

کتاب شروع کرنے سے قبل چند باتیں کتاب نویس سے سن لیجیے :—

(۱) کتاب ایک بےمایہ و نااہل کے قلم سے لکھوانے کی ذمہ دار ہندوستانی اکادمی (یو.پی) کی ایکزیکٹیو کمیٹی ہے - موضوع "پاپولر سائکالوجی" کا انتخاب کمیٹی مذکور کے ممبر صاحبوں نے کیا' اور اس کے لیے لکھنے والے کا انتخاب بھی تمامتر انھیں حضرات نے کیا —— کتاب کے نقائص کی ساری ذمہ داری مجھ ہیچمدان کے سر ہے - اور اگر کہیں کوئی خوبی کسی صاحب کو نظر آجائے تو اس کی داد اکادمی اور ارکان اکادمی ہی کو ملنی چاہیے -

(۲) کتاب کا نام یقیناً ذرا عجیب سا نظر آئے گا' مضمون کتاب کا ترجمان اس سے بہتر مجھے کوئی اور نام نہیں ملا —— موضوع کتاب کے دو جزوں میں سے اپنی والی کوشش اس کی پوری کی ہے' کہ کم سے کم اس کے پہلے جزو کا حق تو کسی طرح ادا ہوجائے —کتاب فن کے اعتبار سے اہل فن کی نظر میں جیسی بھی ٹھیرے بہرحال اس کے "پاپولر" یا عام فہم ہونے میں تو کوئی کسر اٹھ نہ رہے -

(۳) سائکالوجی اب روز بروز ایک "سائنس" بنتی جارہی ہے - تمامتر ناپ تول والی' وزن و پیمائش والی' آلات

مادی والی' اختیاری سائنس —— ان صفحات میں شرح و ترجمانی سائکالوجی کے اُس دور کی ملےگی جب وہ سائنس کی کنیز نہیں بلکہ' فلسفے کی سہیلی تھی - باہر سے زیادہ اندر کی طرف مائل' بصارت سے بڑھ کر بصیرت کی گرویدہ' اور' مشاہدۂ آفاق سے زیادہ مطالعۂ نفس کی قائل -

(۴) یہ مجموعۂ اوراق فن پر کوئی باضابطہ متن (تکسٹ بک) نہیں —— دو تہائی سو صفحوں کے اندر پوری فنی بحثیں لاذا ممکن ہی نہ تھیں —— بلکہ طلبہ اور عام شائقین کے لیے مطالعۂ فن کا گویا صرف مقدمہ ھے - یا بعض عنوانات فن کی صرف چند جھلکیاں - کتاب انگریزی میں ہوتی تو اُس کا نام ہوتا Peeps into Popular Psychology

اسے پڑھ کر عجب نہیں جو کسی کسی کو فن کی باقاعدہ تحصیل و تکمیل کا شوق پیدا ہوجائے اور جو کتاب بطور مقدمہ یا اشارات کے ہوتی ھے' اس کا مقصد ھی شائد بس اسی قدر ہوتا ھے -

(۵) کتاب کے چودہ بابوں میں سے چند (مثلاً توجہ' عادت' جذبات) پہلے بھی کسی نہ کسی صورت میں عالم وجود میں آچکے ہیں —— باقی بالکل نئے ہیں - اور جو پرانے ہیں انہیں بھی لفظی و معنوی ہر قسم کی کثرت ترمیمات سے اب نیا کر دیا گیا ھے -

(۶) ہر باب میں ایک ایک نہیں' کئی کئی انگریزی کتابوں کا نچوڑ آگیا ھے - حوالے ہر جگہ دینے غیرضروری بھی تھے اور موجب طوالت بھی - صرف ایک باب جو تاریخ

فن پر ہے، اس کے آخر میں ماخذوں کا حوالہ متعین طور پر دے دیا گیا ہے۔

(۸) کتاب کوئی ماہر فن دوسروں کو بتلانے سکھلانے کے لیے نہیں لکھ رہا ہے۔ بلکہ محض ایک طالب علم ہے جو خود بھی سیکھنے اور جاننے کے لیے اپنا سبق کھول کر اپنے ساتھیوں کے پاس بیٹھ گیا ہے، عجب کیا جو اُس کی خامیوں اور کوتاہیوں کو دیکھ کوئی ماہر فن اِس موضوع پر قلم اُٹھانے اور لکھنے کا حق ادا کردے۔

عبدالماجد

دریاباد، بارہ بنکی
اکتوبر ۱۹۴۶ء

پہلا باب

راہ کا نقشہ

آپ اگر کسی محکمے کے افسر ہیں، تو یہی چاہتے ہیں کہ آپ کے ماتحت کام خوشی اور خوش‌دلی سے، زیادہ سے زیادہ مقدار میں کریں، اور ہمیشہ آپ ہی کا دم بھرتے رہیں - اس کے برعکس اگر آپ ماتحت ہیں، تو آپ کی عین آرزو یہی رہتی ہے کہ آپ کے افسر آپ سے زیادہ سے زیادہ خوش رہیں - اور آپ کے کام کی اور اہلیت کی تعریف کرتے رہیں - اُستاد یہ چاہتا ہے کہ لڑکوں کی مزاج‌شناسی زیادہ سے زیادہ حاصل کرے - اور لڑکے اس فکر میں رہتے ہیں کہ اُستاد کے رنگ طبیعت سے ناواقفیت زرا سی بھی نہ رہ جائے - قوم کے لیڈر یہ چاہتے ہیں کہ عوام کی بڑی سے بڑی تعداد کو اپنے قابو میں لائیں، اور عوام کی بھی خواہش یہی رہتی ہے کہ اپنے محبوب لیڈروں کی ایک ایک مرضی پہچانتے رہیں —— میاں بیوی، باپ بیٹے، دکاندار اور گاہک، اُستاد و شاگرد، غرض ہر انسانی رشتے اور تعلق میں، زندگی کے ہر شعبے اور گوشے میں، سب سے بڑی اور پہلی ضرورت انسان کو اِنسان کے سمجھنے کی پیش آتی رہتی ہے - اور یہی انسان‌شناسی یا فطرت بشری کی فہم جب ایک باقاعدہ و منظم شکل میں آگئی، جب فنی ضابطوں اور علمی قاعدوں کے اندر یہ مرتب ہوگئی، تو اسی کا نام سائکالوجی یا نفسیات یا علم‌النفس ہے -

اپنی صحت جسمانی سے متعلق گنوار سے گنوار دیہاتی بھی کچھ نہ کچھ ضرور جانتے ہیں، بلکہ بعض اوقات تو پڑھے لکھے شہریوں سے زیادہ اور بہتر ہی جانتے ہیں - لیکن اُنھیں متفرق معلومات کو جب اضافے کے بعد ایک ضابطے کے ساتھ مرتب کر دیا جاتا ھے، تو اُس کا نام فن طب پڑ جاتا ھے - گفتگو میں دلیل و اِستدلال سے کام عامی و عالم سب ہی لیتے ہیں، اور مقدمات سے صحیح نتائج تک اکثر عوام بھی پہنچ جاتے ہیں - اِسی نتیجہ‌دہی کو جب علمی اِصطلاحات کے ساتھ قاعدوں اور ضابطوں میں لے آیا جاتا ھے؛ تو اِسی کا نام منطق پڑ جاتا ھے - یہی حال نفسیات یا سائکالوجی کا ھے - دنیا میں عملی نفسیات سے کام کم و بیش ہر شخص لیتا ھے، اور جو جس پیشے میں جتنا زیادہ کامیاب و مشہور ھے، کہنا چاہیے کہ اُسی قدر وہ نفسیات بشری سے زیادہ واقف ھے - یہ اور بات ھے کہ وہ فن کی اِصطلاحوں سے ناواقف ہو اور ماہروں اور عالموں کی زبان نہ بول سکے - اِنسان کا اپنی باتوں میں بڑا جی لگتا ھے - قصہ کہانیوں کے سننے میں وہ محو ہو جاتا ھے، اِس لیے کہ وہ اپنے ہی جیسے اِنسانوں کی اپنے ہی سے دل و دماغ، ہوش و حواس، طبیعت و مزاج رکھنے والوں کے کارنامے اور سرگزشتیں ہوتی ہیں - بڑے ہو کر اپنے بچپن کی باتیں سننا بہت ہی بھلی لگتی ہیں - اور اپنی آپ بیتی سنانے میں خاص مزہ آتا ھے —— یہی فطری اور طبعی شوق نفسیات کی کتابوں میں ایک علمی رنگ میں پورا ہوتا ھے - اور اپنے ہر خواب کی، ہر خیال کی، ہر شوق کی، ہر عادت کی، ہر ریاضت کی، ہر غم

کی، ہر مسرت کی، ہر سعی عمل کی، تعبیر و توجیہ ملنے لگتی ہے۔

آج جس علم کا نام نفسیات ہے، اُس کے شروع میں بحثیں احساس اور اِدراک کی آتی ہیں۔ اور محسوسات و مدرکات سے مراد وہ معلومات ہیں جو حواس ظاہری، آنکھ، کان، ناک وغیرہ کے ذریعے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اگلوں کے نزدیک اِنسان کے حواس ظاہری پانچ تھے۔ باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ، ذائقہ۔ اب پچھلوں نے تجربہ گاہوں میں کام کر کے بتایا ہے کہ حواس اِنسانی کی تعداد اُن سے بہت زیادہ ہے۔ اور گرمی سردی، سختی نرمی، بھوک پیاس، درد وغیرہ سب کے اِحساسات کا تعلق حواس سے ہے۔ اور اِس لیے حواس کی تعداد ابھی تک غیر متعین ہے۔

نفسیاتی زندگی میں ایک بڑا کارفرما قانون اِئتلاف کا ہے۔ نفس کا ایک طبعی خاصہ یہ ہے کہ ایک خیال دوسرے خیال سے، ایک تصور دوسرے تصور سے کوئی علاقہ یا ربط ضرور رکھتا ہے۔ کبھی ایک خیال دوسرے خیال کے ساتھ لپٹتا، چمٹتا، اُس سے پیوست ہو جاتا ہے اور کبھی اُس سے بھاگتا، گریز کرتا ہے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح کا علاقہ ضرور رکھتا ہے۔ اِسی کو قانون ائتلاف کہتے ہیں۔ اِس کی رنگارنگیوں کو بیان کرنا بھی نفسیات کا ایک اہم عنوان ہے۔ چیزوں کی دماغ میں وابستگی یہیں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور حافظے کی جڑیں یہیں جگہ پکڑتی ہیں۔ اور حفظ ہی کے ساتھ لزوماً بحث اِستحضار کی بھی چھڑ جاتی ہے۔ سہو و نسیان کی شاخیں بھی اِسی اصل سے پھوٹتی ہیں۔

احساس، ادراک، ائتلاف، حافظے کی منزلوں سے گزرنے کے بعد قدرتاً ذہن کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ نئے نئے مسائل کے حل کرنے اور جزئیات سے کلیات تک پہنچنے یا کلیات سے جزئیات تک واپس آنے کی کیا کیا صورتیں ہوتی ہیں یا اُن کے کیا کیا قاعدے، ضابطے ہیں۔ یا اُس کے جواب میں نفسیات کی کتابوں میں تعقل، تخیل، استدلال وغیرہ کے ابواب سامنے آتے ہیں —— ''ذہن'' محض کا لفظ ہم میں سے ہر شخص بولتا ہے۔ اِسی سلسلے میں اس کے مفہوم اور ''ذہانت'' پر بھی مستقل باب فن کی کتابوں میں ملتا ہے۔

یہ بھی ہر ایک کا تجربہ ہے کہ اِحساس و اِدراک، تعقل و اِستدلال کے علاوہ ہم غم و مسرت، خوف اور غصہ وغیرہ سے بھی برابر متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہیں سے یہ ہے کہ نفسیات کی کتابوں میں جذبات سے بحث ضرور ہوتی ہے۔

لیکن نفس بشری میں وقوفی اور جذبی دونوں کیفیات سے بڑھ چڑھ کر ایک چیز عمل اور سعی عمل کی موجود رہتی ہے یعنی زندگی میں بہت سے اعمال ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں بغیر ہم کسی اہتمام و قصد کے گویا از خود کسی اندرونی تقاضے سے مجبور ہوکر کر گزرتے ہیں۔ اِن اندرونی تقاضوں کے لیے ایک عام نام جبلت ہے۔ یہ تقاضے وراثت کی راہ سے آتے ہیں، اور اِن میں کسب و اکتساب کو دخل نہیں ہوتا۔ البتہ سیکھنے سے جبلتوں میں ترمیم ہوتی رہتی ہے، اس لیے قدرتاً نفسیات میں بحث، عادت اور اعمال اکتسابی کی بھی آجاتی ہے۔ اور پھر اُن اعمال کی جو تمامتر اِرادے کے محکوم ہوتے ہیں۔

نفسیات کا تعلق کچھ نہ کچھ تو ہر ایسے علم کے ساتھ ہے جس کا موضوع انسان ہے ۔ لیکن بعض فنون کے ساتھ اِس کا تعلق خاص طور پر گہرا اور قوی ہے ۔ نمبر اول پر طب ہے ۔ ہسٹیریا، خفقان، مالیخولیا، جنون کے مختلف اقسام، ضعف حافظہ وغیرہ دماغی، خیالی، عصبی امراض کثرت سے ایسے ہیں، جن کی تشخیص اور علاج دونوں میں نفسیین ہی کا مشورہ کارگر ہو سکتا ہے ۔

قانون سے بھی نفسیات کا تعلق کچھ کم گہرا نہیں ۔ اِرتکاب جرم میں نیت کا دخل کہاں تک ہوتا ہے ؟ احمق اور بےعقل پر ذمہ‌داری کس حد تک اپنے قول و عمل کی عائد ہوتی ہے ؟ گواہ اگر اِختلال حواس میں مبتلا ہے تو اُس کی گواہی کس حد تک قابل اِعتبار ہو سکتی ہے ؟ مجرم کی ذہنیت کیا ہوتی ہے ؟ مدعی کی نفسیت اور مدعاعلیہ کی نفسیت میں فرق کیا کیا ہوتا ہے، اور اشتراک کہاں تک ملتا ہے ؟ جذبات کا اثر گواہوں اور فریقین مقدمہ کے بیانات پر کیا پڑتا ہے ؟ اِس قسم کے بیسیوں قانون اور عدالتی سوالوں کا جواب نفسیات ہی سے مل سکتا ہے ۔

تیسرا قریبی تعلق رکھنے والا فن تعلیم ہے ۔ تعلیم و تربیت کا دار و مدار ہی طالب‌علم کی فطرت‌شناسی پر ہے ۔ اِس لیے نفسیات کی ماہیت معلم یا اُستاد کے لیے بالکل ظاہر ہے ۔ توجہ، انضباط، حافظہ، اِستحضار، تعقل، اِدراک، اِستدلال عادت، مشاہدہ، جذبات، اِرادہ، کہنا چاہیے کہ ساری ہی نفسیاتی بحثوں کا تعلق تعلیمات سے ہے ۔ اور ایک معنی میں کہا جاسکتا ہے کہ نفسیات ساری کی ساری تعلیمی ہی نفسیات ہے ۔

دوسرا باب

فن کی سرگزشت [۱]

علم و فن کوئی سا بھی ہو، اُس کی اِبتدائی تاریخ یا سرگزشت بیان کرنا آسان نہیں، شروع شروع جب فن کی بنیادیں پڑتی ہوتی ہیں، کسی کو اِس کا خیال بھی نہیں گزرتا کہ کوئی بہت اہم اور تاریخی شے وجود میں آرہی ہے - جب فن کی جڑیں خوب مضبوط ہو چکتی اور بنیادیں اچھی خاصی بلند ہو چکتی ہیں، جب کہیں لکھنے والوں کی اِس طرف توجہ ہوتی ہے کہ یہ بھی کوئی شے قابل ذکر و تحریر ہے - اور جب تاریخ لکھنے کا وقت آتا ہے، تو زمانہ اتنا گزر چکا ہوتا ہے کہ اِبتدائی نقش صرف دھندلے ہی سے نظر آسکتے ہیں - طب کی، قانون کی، انجینری کی، شاعری کی، جس فن کی بھی اِبتدائی تاریخ کا کھوج لگائیے، یہی صورت پیش آئے گی -

نفسیات کی بنیاد تو حقیقتاً اُسی دن پڑ گئی، جب اِنسان

---

[۱] نفسیات کی ترقی ہندوؤں کے بہت قدیم، اور مسلمانوں کے نسبتاً "جدید" دونوں کے عروج و اِقبال کے زمانوں میں ہوئی، اور خوب خوب داد تحقیق دی گئی - دوسری قدیم قوموں نے بھی اپنے اپنے رنگ میں خدمت کی، لیکن یہاں مقصود صرف مغربی نفسیات کی سرگزشت ہے اور اس کا تعلق چونکہ یونان کی علمی تاریخ سے ناگزیر ہے، اس لیے یونان کا ذکر بھی آئے گا-

نے خود اپنے بارے میں سوچنا شروع کیا - نفسیاتی بحثوں کے قدیم ترین حوالے یونان کی پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح کی تحریروں میں ملتے ہیں، بلکہ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اِس سے بھی قبل، دسویں صدی قبل مسیح میں - نفسیات اُس وقت کوئی مستقل اور علیحدہ فن نہ تھا بلکہ علم فلسفہ کا ایک جزو تھا - چھٹی صدی قبل مسیح کے طبی نوشتوں میں یہ صاف صاف ذکر موجود ہے کہ حواس اور چیز ہیں اور عقل اور - دماغ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اور آلات حواس کا تعلق اُسی سے ہے - اُس وقت کی تشریح (اناتومی) کا آج کی تحقیقات سے کیا مقابلہ - لیکن یہ اصل اُصول اُس وقت بھی مان لیا گیا تھا کہ بصارت اور سماعت کا اصل تعلق نفس سے ہے، اور آنکھ اور کان محض ظاہری آلے ہیں - مزاج کی بحث بھی اُس وقت کا ایک اہم طبی موضوع تھا - اور مزاج کو نتیجہ بلغم، خون، سودا و صفرا چاروں خلطوں کا قرار دیا گیا تھا - خلطوں کی یہ اِصطلاح، ہے تو عربوں کی چلائی ہوئی، کئی صدیوں بعد کی - لیکن اصلاً یہ ترجمانی اُسی یونانی ذہنیت کی ہے ـــــ موجودہ نفسیات کی ساری عمارت کی پہلی اینٹ یہ ہے کہ روح سے قطع نظر نفس کوئی مستقل ہستی موجود ہے اور یہ اینٹ اُس وقت تیار ہو چکی تھی -

فلاطون (متوفی ۳۴۸ ق، م) کے وقت تک بڑا زور روح پر رہا - اور فلاطون ہی نے غالباً فلسفی دیقراطیس (پیدائش ۴۷۰ ق، م) سے لےکر اس خیال کو چمکایا کہ جگر، محل و مستقر خواہش کا ہے اور دل شجاعت کا، اور دماغ عقل

کا - لیکن فلاطون کو براہ راست نفسیات سے کوئی دلچسپی نہ تھی - اُس کے ہاں نفسیاتی بحثیں جو کچھ بھی آتی ہیں، اخلاقیاتی اور اِلہیاتی مباحث کے لپیٹ میں - نفسیات پر کہنا چاہیے کہ سب سے پہلی کتاب ارسطو (متوفی ۳۲۳ ق، م) کی ہے - اور ارسطو ہی کی تعلیمات یورپ میں اٹھارویں صدی کے آخر تک نفسیات کے مدرسوں میں جاری رہی -

ارسطو اِس کا قائل تھا کہ انسان کی حیات حیوانی حرکت و حرارت سے مرکب ہوتی ہے - اعصاب کے وجود سے وہ ناواقف تھا - اُس کا نظریہ یہ تھا کہ خون کی شریانوں میں ہوا بھری رہتی ہے - اور حواس ظاہری پانچ ہیں، لامسہ، ذائقہ، شامہ، سامعہ و باصرہ - یا کہ درحقیقت بنیادی طور پر یہ حس لمس ہی ہے، جو پانچ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے - ارسطو نے اِس پر بہت تفصیل سے لکھا، گو خون کی اہمیت سے مغالطہ کھاکر اُس نے ساری نفسی زندگی کا مرکز و مستقر بجائے دماغ کے قلب کو قرار دیا - ارسطو ہی نے یہ بھی بتایا کہ ایک خیال اور تصور دوسرے خیال اور تصور کو پیدا کرتا ہے، اور افکار میں باہم ایک قاعدہ 'تلازم اور تسلسل' کا رہتا ہے -

سکندر اعظم (وفات ۳۲۳ ق، م) کے بعد سے یونان کے علوم عقلی پر زوال آگیا، اور یہ زوال و جمود کوئی پانچ صدیوں تک برابر قائم رہا - سنہ مسیحی کی تیسری صدی میں فلاطین اسکندری کے اثر سے پھر اس میں حرکت پیدا ہوئی - مشہور طبیب جالینوس (وفات ۲۰۰ ع) نے ایک تو حسی اعصاب اور حرکی اعصاب کے درمیان فرق کا انکشاف کیا، اور

روح و جسم کے باھمی تعلقات پر بھی حکیمانہ خیالات کا اِظہار کیا - پانچویں صدی عیسوی سے لےکر بارھویں صدی تک مسلمان فاتحین کے اثر سے یہ علوم پھر سے چمکنے شروع ھوے اور تیرھویں صدی میں پوری طرح چمک گئے - نفسیات کے مورخ' جی' اس' برٹ (Brett) کے الفاظ ھیں :—

The revival of learning in the twelfth century and its more complete restoration in the thirteenth was due in large part to the rise and progress of the Arab empire.

علوم کا اِحیاء بارھویں صدی میں' اور پھر اُس اِحیاء کی تکمیل تیرھویں صدی میں' بڑی حد تک عرب حکومت کے نشو و نما ھی کا ثمرہ ھے -

ساتویں صدی عیسوی میں مسلمان جب ایران و عراق پر قابض ھوے' تو یونانی علوم و فنون جو شام و اطراف شام میں پھیلے ھوے تھے' مسلمان اُن پر بھی قابض ھوگئے' اور تیرھویں صدی میں اُنھیں کے ذریعے سے یورپ میں بھی یونانی علوم پھیلے' اور انھیں علوم میں یونانی نفسیات بھی تھی -

جس علم کا نام یورپ کی موجودہ اِصطلاح میں نفسیات ھے' اُس کی داغ‌بیل ٹامس ھابس انگریزی (وفات ۱۶۷۹ ع) کے ھاتھ سے پڑی - ھابس نے حس' ارادہ' تخیل' تلازم سب پر گفتگو کی - اُس کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ھے کہ :—

"جسم میں ھیجان سے جو حرکت پیدا ھوتی ھے' اُس کا نام حس ھے - اور حس جب اپنے سبب قریب کے ختم ھوجانے کے بعد بھی قائم رھے' تو اُس کا نام تخیل ھے - اور خارجی

تاثرات سے ذہن کے اندر جو نقش پیدا ہوتے ہیں، وہ خواب کہلاتے ہیں - اور جب تجربے سے حاصل‌شدہ تصورات میں جمع و تفریق کا عمل ہونے لگے تو اُس کا نام اِستدلال یا تعقل ہے - اور جس طرح حس، حرکت افدرونی کا نام ہے، حرکت بیرونی کو اِرادہ کہتے ہیں -

ھابس اصلاً و براہ راست نفسیاتی نہ تھا، اُس کی اولین حیثیت ایک مصلح معاشرت کی تھی - اِس غرض کے لیے اُسے نفسِ بشری کے خصوصیات سے بھی واقفیت ضروری معلوم ہوئی اور اُس نے ارسطو ہی کی بلند کی ہوئی دیوار پر ایک اور ردا رکھا - لاک کا مقالۂ فہم انسانی ۱۶۹۰ع میں شائع ہوا - اور اُس میں سارا زور بجاے روح کے نفس کے تلازم افکار پر تھا - هیوم (وفات ۱۷۷۶ع) کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے سارے تجربۂ بشری کی تحلیل نقوش اور تصورات میں کر ڈالی - اور ارسطو کے بتائے ہوے قانون تلازم ذکری کو اُس نے مماثلت و مقارنت کے شعبوں میں خوب چمکا دیا - ہیوم کے شاگرد جیمس مل نے اپنے شاگرد الگزنڈر بین تک یہ رنگ منتقل کر دیا -

اِدھر برطانیہ میں یہ ہوتا رہا، اُدھر جرمنی میں لائبنز (وفات ۱۷۱۶ع) اور تینسز (وفات ۱۸۰۷ع) جیسے مشاہیر پیدا ہوتے رہے - نفس کی تقسیم و تحلیل تین حصوں، یعنی وقوف، احساس و ارادہ میں جو آج مسلم ہے، اُس کے آغاز کا سہرا لائبنز ہی کے سر ہے - ورنہ اِس کے قبل مسلم تقسیم صرف ۱—وقوف و ۲—ارادہ کی تھی - لائبنز کی کتاب تصنیف

تو ۱۷۰۴ع کی ھے - لیکن شائع جاکر ۱۷۶۱ع میں ھوئی تیننس کی کتاب ۱۷۷۷ع میں -- فرانس اور آسٹریا کے بھی اهل فن اِس درمیان میں اپنے کام میں لگے رھے -

اُنیسویں صدی یورپ میں سائنس اور سائنسی علوم کی ترقیوں کی صدی ھے - نامور نفسیین اُس کے نصف اول میں ٹامس براؤن، جیمس مل، سر ولیم هملٹن ھوے اور سب سے بڑھ کر هربارٹ (جرمن) جو اپنے مسئلۂ اِدراک (Apperception) کے دریافت کے لیے خاص طور پر مشہور ھے - بہت سے لوگ جدید نفسیات کا بانی اول هربارٹ (وفات ۱۸۴۱ع) ھی کو قرار دیتے ھیں - اِس کی اهم تصانیف کی اِشاعت کا زمانہ ۱۸۱۶ع سے ۱۸۲۲ع تک ھے -

لیکن هربارٹ کے اُصول بڑے محققانہ سہی، نفسیات کے مطالعے میں اِنقلابی نقطے کا آغاز جرمنی جوهانز میولر (سال تصنیف ۱۸۲۵ع) کی تعلیمات سے ھونا ھے - میولر فلسفے کا نہیں، فعلیات اور تشریح کا ماھر تھا - نظام عصبی کی اهمیت کا راز اُسی نے بتایا، اور حرکت قمری پر گفتگو اسی نے اول بار کی، ورنہ اب تک سارا زور بجاے جسمی فعلیت کے روح کی تفسیر و تشریح پر تھا - نفسیاتی تحقیقات کا رخ یہیں سے بدلا - اب تک مرکز بحث شعور تھا - اب لاشعوری کیفیتیں بھی زیر بحث آنے لگیں - شوپنہائر (جرمن، وفات ۱۸۶۰ع) فلسفی تھا، نفسی نہ تھا، تاھم جلدبازی سے کام لےکر اُس نے لاشعوریت کے فلسفے پر بہت کچھ لکھ ڈالا - میولر کے شاگردوں اور معاصرین نے تجربی اور اِختیاری پہلوؤں

پر اور زیادہ توجہ کی - چنانچہ انہیں کی کوششوں سے اب نفسیات بجائے فلسفے کی ایک شاخ کے خود ایک مستقل فن شمار ہونے لگا - ویبر (وفات ۱۸۹۱ع) فچنر (وفات ۱۸۸۷ع) لوتس (وفات ۱۸۸۱ع) ہلموتس (وفات ۱۸۹۴) اور ونڈت (وفات ۱۹۲۰ع) کے نام اسی سلسلے میں خاص طور پر لیے جانے کے قابل ہیں - نفسیات اب فلسفے سے کہیں زیادہ سائنس سے قریب آگئی تھی -

اِدھر یہ تجربی ترقیاں جرمنی میں ہوتی رہیں، اُدھر برطانیہ میں ڈارون کے مسئلۂ ارتقاء کے اثر سے بین (وفات ۱۹۰۳ع) لوئیس (وفات ۱۸۷۸ع) اور اسپنسر (وفات ۱۹۰۳ع) فن میں خوب داد تحقیق دیتے رہے - اسپنسر (مصنف "پرنسپلز آف سائکلوجی" ۱۸۵۵ع) کے ہاں تو خیر لفاظی زائد ہے، لیکن بین، جس کی تصنیفی عمر ۱۸۵۵ع سے ۱۸۸۱ع تک ہے، اس کے کارنامے آج تک قابل داد ہیں - فرانسیسی اور اطالوی فاضل بھی اِس دوران میں اپنی اپنی جگہ خوب کام کرتے رہے - اور نفسیاتی اصول، نظریات کو افراد سے گزر کر جماعتوں پر اور مسائل تعلیم پر چسپاں کرتے رہے - انیسویں صدی کے نصف آخر کے ماہرین فن میں سب سے زیادہ روشن نام جیمس وارڈ (وفات ۱۹۲۵ع) اور اُن کے شاگرد پروفیسر استاوت (وفات ۱۹۲۸ع اور جیمس سلے (وفات ۱۹۲۳ع) کے ہیں - بین نے رسالۂ مائنڈ (Mind) ۱۸۷۶ع سے نکالنا شروع کر دیا تھا، اور اسی زمانے سے فرانس، جرمنی، اٹلی سے بھی اسی قسم کے رسالے نکلنے لگے، اور مذہب، قانون، معاشرت،

تعلیم، تجارت وغیرہ زندگی کے ہر شعبے پر نفسیاتی پہلوؤں سے کثرت سے نظر کی جانے لگی -

لیکن یورپ سے بھی بڑھ کر جہاں نفسیات کی تجربی شاخیں پھلیں پھولیں، وہ ملک امریکہ کا تھا - ۱۸۸۳ع ھی سے یہاں کی مختلف اور متعدد یونیورسٹیوں میں نفسیاتی تجربہ گاھیں، اور کام فن کے علمی اور عملی دونوں پہلوؤں پر زوروں سے ھونے لگا - اسٹینلی ھال (وفات ۱۹۲۴ع) ولیم جیمس (وفات ۱۹۱۰ع) میونسٹر برگ (وفات ۱۹۱۶ع تشنر [۱] (وفات ۱۹۲۱ع) بالڈون (وفات ۱۹۳۰) اور میکڈوگل (وفات ۱۹۳۲ع) کا شمار امریکہ کے اُستادان خصوصی میں ھے - جیمس کا مرتبہ سب سے فائق ھے - اُس کی پرنسپلز آف سائکالوجی عمق نظر اور صحت تحقیق کے لیے آج بھی تقریباً ویسی ھی قابل قدر ھے، جیسی آج سے ۵۵ - ۶۰ سال قبل ۱۸۹۰ع میں اپنی اول اشاعت کے وقت تھی -

اب بیسویں صدی کا زمانہ آگیا تھا - اب سائکالوجی ایک اسم جنس قرار دیا گیا - ایک دو نہیں، متعدد مثالیں "چائلڈ سائکالوجی" (نفسیات طفلی) "اینیمل سائکالوجی" (نفسیات حیوانی) "سوشل سائکالوجی" (نفسیات اجتماعی) "ایجوکیشنل سائکالوجی" (نفسیات تعلیمی) "انڈسٹریل سائکالوجی" (نفسیات حرفتی) وغیرہ کے نام سے نکل آئیں، اور ھر شاخ کثرت تصانیف

---

[۱]__ تشنر اور میکڈوگل اصلاً دونوں برطانوی ھیں، لیکن اُن کے کاموں کی خاص شہرت امریکہ جا کر ھوئی، اِس لیے یہاں اُن کا شمار امریکی فنسیین میں کیا گیا -

اور تنوع مباحث کے لحاظ سے بجائے خود ایک مستقل فن بن گئی ھے - رسالے، مقالے اور کتابیں، ان میں سے ایک ایک شاخ پر اس افراط سے شائع ہو رہی ہیں، کہ فن کا کوئی شائق، خیر ساری سائکالوجی کے لٹریچر کو تو کیا پڑھ سکتا ھے، اس کے کسی ایک ہی شاخ کے ذخیرے پر پوری نظر رکھ لے تو بہت بڑی بات ھے -

ہندوستان میں ۲۵ سال قبل تک سائکالوجی عموماً صرف کتابوں کے ذریعے سے پڑھائی جاتی تھی - اب البتہ متعدد یونیورسٹیوں میں اِس کے لیے باقاعدہ تجربہ گاہیں کھل گئی ہیں، اور یہ فن سوچنے سمجھنے سے زیادہ ہاتھ کے کرنے اور نقشوں اور آلات کے استعمال کا ہوگیا ھے یہ بات عام واقفیت کی غرض سے بیان کردی گئی، ورنہ ان صفحات میں جس پاپولر سائکالوجی (عام فہم اور عوامی نفسیات) کی تشریح ہوگی، وہ اسی قدیم طرز کی ھے - عملی و تجربی سے کہیں زیادہ عقلی و اُصولی -

ماخذ :-

1. Baldwin's 'History of Psychology, 2 vols.

2. Brett's 'History of Psychology, 3 vols.

3. Ency. Britt. (14th Ed.) vol. 18, Art. 'History of Psychology.'

4. Flugel's 'A Hundred Years of Psychology.'

تیسرا باب

اپنا چہرہ اپنے آئینے میں

ہم راستے میں جارہے ہیں کہ پیر میں ایک پتھر کی ٹھوکر لگی، چوٹ آئی - اور "درد" و "اذیت" محسوس ہوئی - پتھر بدستور، اپنی جگہ جوں کا توں رہا - وہ نہ کراہا، نہ اُس نے آہ کی —— ہو نہ ہو، پتھر اور ہماری بناوٹ میں کچھ فرق ضرور ہے!

آپ نے سنا کہ آپ کے فلاں دوست پاس ہوگئے، آپ "خوش" ہوگئے - پھر خبر ملی، کہ فلاں عزیز سخت بیمار ہوگئے ہیں-اس سے بہت دل "کڑھا"- آپ پر دن رات یہ گزرتی ہی رہتی ہے - لیکن آپ کے کمرے کی میز و کرسیاں، در و دیوار، یہ عجب بےحس مخلوق ہیں اُن کا نہ کوئی دوست نہ کوئی عزیز - نہ اُنھیں کوئی خوشی، نہ کبھی کوئی رنج —— بڑا فرق آپ میں اور اِن موجودات میں نکلا!

اچھا یہ صاحب جو ملنے چلے آ رہے ہیں، کون ہیں، کہاں کے ہیں؟ صورت "آشنا" تو معلوم ہوتے ہیں - کہیں انھیں دیکھا ضرور ہے - ہاں، خوب "یاد" پڑگیا - وہی تو ہیں جن سے ابھی اُس دن اسٹیشن پر ملاقات ہوئی تھی - اب "پہچان" لیا —— یہ بات کیا ہے، کہ یہ درخت اور پودے ہماری آپ کی طرح کیوں کسی کو "جان پہچان" نہیں لیتے؟ یہ "حافظہ" پر زور دے کر کوئی بات کیوں نہیں "یاد" کرلیا کرتے!

صبح ہوئی، اور ہم نے اپنے "ارادہ" سے کام لینا شروع کیا - جب جی "چاہا" اُٹھ بیٹھے - جب اور جہاں "چاہا" چلے پھرے اُٹھے بیٹھے - "بھوک" لگی تو کھایا - پانی کی "خواہش" ہوئی تو پانی پیا - ارادہ "بازار" جانے کا کیا - پھر "ارادہ" بدل دیا - پارک چلے گئے - اور ایک ہم کیا، آپ بھی تو دن رات یہی کیا کرتے ہیں - اسی طرح اپنے 'ارادوں' اور اپنی 'خواہشوں' کو پورا کیا کرتے ہیں، اور ہم اور آپ کیا معنی زید، عمر بکر، جان، جیمس، کرشن، لچھمن، سارے انسان کہلانے والے یہی کرتے رہتے ہیں —— کتنی مختلف ہیں انسان سے کتابیں اور الماریاں، تصویریں اور کٹہرے، پھول اور پتے، دریا اور پہاڑ! سب اپنی جگہ جوں کی توں، کسی میں نہ کوئی ارادہ نہ کوئی خواہش!

اِن مشاہدوں نے بتا دیا، صاف طور پر جتا دیا، کہ انسان اپنے گردوپیش کی جامد اور بےجان فضا سے ایک بالکل ہی مختلف قسم کا مخلوق ہے - وہ دیکھتا ہے، سنتا ہے، سمجھتا ہے، سوچتا ہے، پہچانتا ہے، یاد کرتا ہے، ہنستا ہے، روتا ہے - خواہش اور اِرادہ رکھتا ہے - جمادات یہ کچھ بھی نہیں کر پاتے - انسان بھی یہ سب کچھ اُسی وقت تک کرتا دھرتا ہے، جب تک جسم میں جان ہے - جب جان نہ رہی تو انسان اور مٹی برابر - انسان اور انسان کی لاش کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے ——— جو شے انسان کو جمادات سے ممتاز کرنے والی ہوئی اس کا نام صفت حیات ہے -

حیات مطلق میں حیوانات بھی انسان کے شریک ہیں - چلتا پھرتا یہ بھی ہے، چلتے پھرتے وہ بھی ہیں - کھاتا پیتا یہ بھی ہے، کھاتے پیتے وہ بھی ہیں - سانس یہ بھی لیتا ہے، سانس وہ بھی لیتے ہیں - حیات مادی کے پہلو بہ پہلو ایک دوسری قسم کی حیات بھی انسان میں پائی جاتی ہے - اوپر کے پیراگراف اسی صفت حیات کے ترجمان ہیں - اسی زندگی کو حیات نفسی کہتے ہیں - اور جو علم اس زندگی کے قانون اور قاعدے، اصول اور ضابطے بیان کرتا ہے، اُس کا نام اصطلاح میں علم النفس یا نفسیات ہے -

یہیں سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ اس قسم کے سوالات، کہ انسان پیدا کیوں کر ہوتا ہے، وفات کس طرح پاتا ہے، اُس کا سلسلۂ نسل کیسے چلتا ہے، نشوونما کیوں کر پاتا ہے - خون کیسے بنتا ہے، سانس کا انتظام کیا رہتا ہے، غرض مادی و جسمانی زندگی سے متعلق جتنے بھی سوال ہو سکیں، یہ سب نفسیات کے دائرے سے خارج ہیں - ان کے لیے الگ علوم فعلیات و حیاتیات کے نام سے ہیں - نفسیات کے حصے میں تو اس قسم کے مسائل پڑے ہیں، کہ عقل و فکر کیا چیز ہے؟ جذبات سے کیا مراد ہوتی ہے؟ خواب کس طرح دکھائی دیتے ہیں؟ عقل کا خواہش سے کیا رشتہ ہے؟ عادت کو ارادے میں کتنا دخل ہے؟ یکسوئی کی راہ میں موانع کیا کیا پیش آتے رہتے ہیں؟ اشتہارات سے انسان کیوں متاثر ہوجاتا ہے؟ اسی طرح کے مسائل کی گرہیں جس علم میں آکر کھلتی ہیں، یا کھلنے کے قریب آجاتی ہیں - اُسی کا نام نفسیات ہے -

فعلیات کے اندر جڑے ہوئے سیکڑوں چھوٹے بڑے مسئلے ہیں - سب کا آخری سلسلہ جاکر جسم پر ختم ہوتا ہے ـــــ نفسیات کے اندر جڑے ہوئے سیکڑوں مسئلے رہتے ہیں، سب کا آخری تعلق جس شے سے ہے اس کا نام نفس ہے - دائرے کے اندر خطوط کتنے ہی ہوں، مرکزی نقطہ ایک ہی ہوتا ہے - نفسیات کو اگر دائرہ فرض کیا جائے، تو نفس اُس کا مرکز کہلائے گا - سارے سوالات گردش اسی محور پر کریں گے ـــ حیات نفسی کی روح کا نام نفس ہے -

اور اسی نفس کی عقلیت کا اصطلاحی نام شعور ہے - ہم نے کچھ سنا، کچھ دیکھا، کچھ یاد کیا، کچھ خیال کیا، کسی چیز کو پسند کیا، کسی چیز کو ناپسند کیا، کسی بات پر خوش ہوئے، کسی پر ناخوش ہوئے، کسی عمل کا ارادہ کیا، کسی ارادے سے باز رہے - اسی قسم کے سارے افعال و کیفیات کا مجموعی نام شعور ہے ـــ کسی مسئلے کو ہم سمجھے، یہ ایک شعوری کیفیت ہوئی - کسی بات پر ہمیں غصہ آیا - یہ دوسری شعوری کیفیت ہوئی - کسی چیز کو ہم نے چاہا کہ کسی سے چھین لیں - یہ تیسری شعوری کیفیت ہوئی - تینوں کیفیتیں باہم بالکل مختلف، تاہم تینوں شعور ہی کی جلوہ آرائیاں - جزئی کیفیتیں شعور کے ماتحت بیشمار سہی، لیکن نوعی حیثیت سے ان کی حدبندی کی جا سکتی ہے - جس طرح خواص مادہ کو چند مخصوص و متعین علوم کے اندر محدود و تقسیم کر لیا گیا ہے -

ہم نے کوئی آواز "سنی" - کوئی چیز "دیکھی" - کسی بات کو "سوچا" - کسی مسئلے کو "سمجھا" کسی واقعے کو "یاد" کیا - کسی بحث سے کوئی "نتیجہ" نکالا، کسی کو "پہچانا" - اِن سارے متفرق واقعات میں ایک چیز مشترک نکلی - یعنی ان اعمال اور کیفیات سے صرف علم یا اطلاع، یا واقفیت میں اضافہ ہوا، کوئی مسرت یا ناگواری براہ راست ان افعال میں نہ پیدا ہوئی - ہو سکتا ہے، اور ہوتا رہتا ہے کہ اِن اعمال کے نتیجے ہمارے لیے دردانگیز یا مسرت خیز ہوں، لیکن براہ راست ان افعال سے کوئی خوشی یا رنج ہمیں نہیں پہنچا، صرف واقفیت یا علم ہی میں اضافہ ہوا —— ریاضی کا فلاں سوال ہم آج تک یہ سمجھے ہوئے ہیں، کہ یوں نکلے گا، آج اُستاد نے بتایا کہ نہیں، بلکہ یوں نکلے گا، اس سے ہماری معلومیت میں اضافہ ہوا، اور کچھ نہ ہوا - تاریخ آج ہمارے خیال میں پہلی تھی، ابھی خیال آیا کہ پہلی تو کل ہوگئی، آج دوسری ہے - یہاں بھی ایک بات محض یاد پڑگئی، اس سے زائد کچھ نہیں ہوا - ہمارے سامنے دو چیزیں آئیں، ہم نے دیکھ کر بتادیا کہ یہ سرخ رنگ کی ہے، یہ سبز کی - اس میں بجز اس کے کچھ نہ ہوا کہ ہم نے تمیز یا شناخت سے کام لیا - اس نوعیت کے سارے افعال کا مجموعی نام وقوف ہے -

ہم راستے میں جارہے تھے، کہ ٹھوکر لگی، اس سے فی الفور اور بلا واسطہ "تکلیف" محسوس ہوئی - اپنی کامیابی کی خبر سننے میں تو "خوشی" ہوتی ہے - ناکامی سننے میں، تو "رنج" ہوتا ہے - کوئی توہین کرتا ہے تو "غصہ" آجاتا ہے -

کسی ڈراؤنی چیز سے سابقہ پڑتا ہے تو "ڈر" لگنے لگتا ہے —— غرض اس طرح رنج و راحت، درد و حسرت، الم و لذت خوف و ہیبت، محبت و الفت، غیظ و غضب، نفرت و عداوت رشک و حسد، کی بیشمار کیفیتیں پیش آتی رہتی ہیں - ان سب میں رشتۂ اتحاد یہ ہے کہ وقوفی کیفیتوں کے برعکس، اُن سے براہ راست، بالذات ناگواری یا خوش‌گواری پیدا ہوتی رہتی ہے؟ اُن کے لیے اصطلاح میں نوعی نام احساس ہے -

بات چیت کرنے کو ہمارا جی "چاہا" اور ہم بولے - مٹھائی کھانے کی "خواہش" ہوئی، اور یہ خواہش پوری کی - کہیں جانے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور اس "قصد" سے ہم اُٹھے —— وقوفی اور احساسی دونوں قسم کے تجربوں میں ہم محض متأثر رہتے ہیں، مؤثر نہیں ہوتے - نفس کی حالت انفعالی رہتی ہے، فاعلی نہیں ہوتی - اب جن تجربوں کی مثالیں سامنے آئیں، ان سب میں نفس کی حالت فاعلی نکلی - ہم مؤثر ثابت ہوئے - شعور کی اس تیسری نوعی فعلیت کے لیے جامع اصطلاح ارادہ کی ہے -

وقوف، احساس اور ارادے کی انھیں تینوں کیفیات کا مجموعہ شعور ہے - اس کے عنصر اصلی یہی تین ہیں - شعوری کیفیت جو بھی ہوگی، انھیں تین عنوانوں میں سے کسی کے تحت میں رکھی جا سکتی ہے - ذیل کا نقشہ بھی اسی کی توضیح کے لیے ہے :——

نفس

فعلیت نفس = شعور

حیثیت انفعال | حیثیت فاعلی

وقوف (سوچنا، سمجھنا، یاد کرنا، شناخت کرنا، وغیرہ)

احساس (رنج، راحت، حیرت، رشک، محبت، غصہ، وغیرہ)

ارادہ (لکھنا، پڑھنا، چلنا، مارنا، وغیرہ)

زندگی کی تعریف ماہرین جسمیات و عضویات نے یہ کی ہے کہ زندگی اس خاص تناسب و توازن کا نام ہے جو جسم اور اس کے ماحول کے درمیان پایا جاتا ہے - جسم کی گرمی اور فضا کی گرمی کے درمیان جب تک تناسب و تطابق قائم ہے، انسان زندہ ہے - جسم کی ضرورتوں اور کائناتی عنصروں کے درمیان جب تک توازن قائم ہے، زندگی بھی قائم ہے ——— شعور کی تعریف اسی انداز پر یہ کی جا سکتی ہے، کہ شعور اس خاص تناسب و توازن کا نام ہے جو نفس اور اس کے ماحول کے درمیان پایا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے، کہ نفس اور ماحول کے درمیان تاثیر، تاثر، فعل و انفعال کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہے - اور اس کا نام جب تک انسان اس پر مطلع و باخبر رہے، شعور ہے -

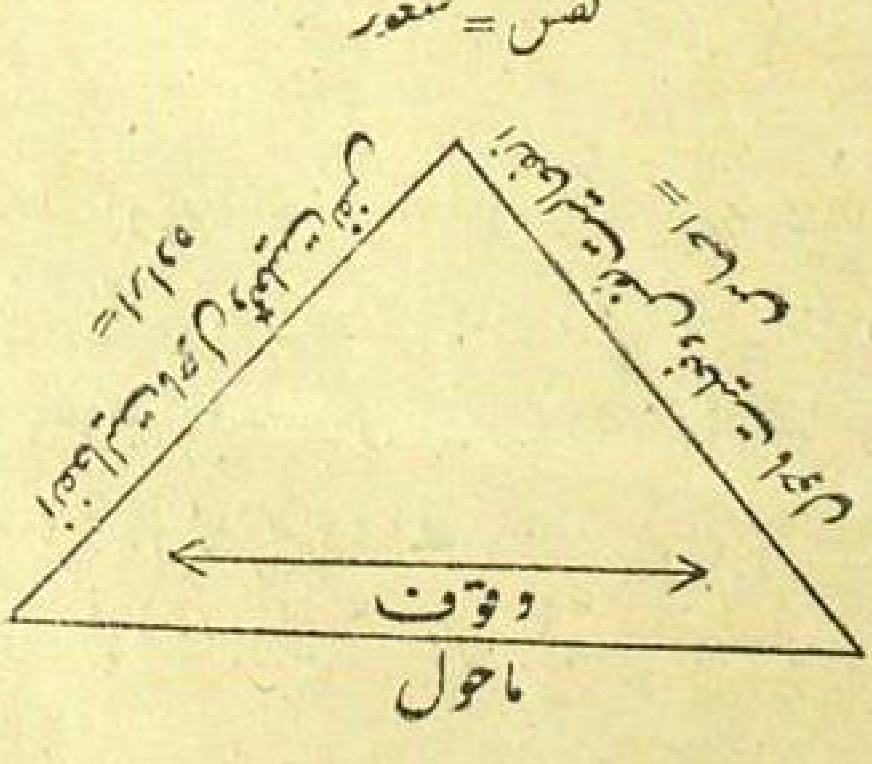
اسی سے اس حقیقت کو بھی ضم کر لیجیے کہ اس تطابق و توازن کی ممکن صورتیں دو ھیں :—

(۱) ایک یہ کہ نفس، ماحول سے اثر قبول کرے - خود متاثر و معمول ھو -

(۲) دوسری یہ کہ نفس، ماحول پر اثر ڈالے - خود موثر و عامل ھو -

نفسیاتی ترتیب میں پہلا جزو دوسرے پر مقدم ھے - ذھن کی بالکل ابتدائی حالت انفعالی ھی ھوتی ھے - اس میں وہ ماحول سے صرف خوشگواری یا ناگواری کا اثر قبول کرتا ھے - اس منزل کا نام احساس ھے - اس کیفیت سے متاثر ھو کر نفس خود کچھ عمل کرنا چاھتا ھے - اس کیفیت فاعلی کا نام ارادہ ھے - لیکن ارادے کو وجود میں لانے، شکل دینے کے لیے محض احساس کافی نہیں، بلکہ ماحول کا ادراک اور مختلف اشیاء کے درمیان امتیاز بھی ضروری ھے - شعور کی اس تیسری، اور رابطہ پیدا کرنے کی درمیانی کیفیت کا نام وقوف ھے - یہ رابطہ، نفس کی انفعالیت اور فاعلیت کے درمیان واسطہ ھوگا -

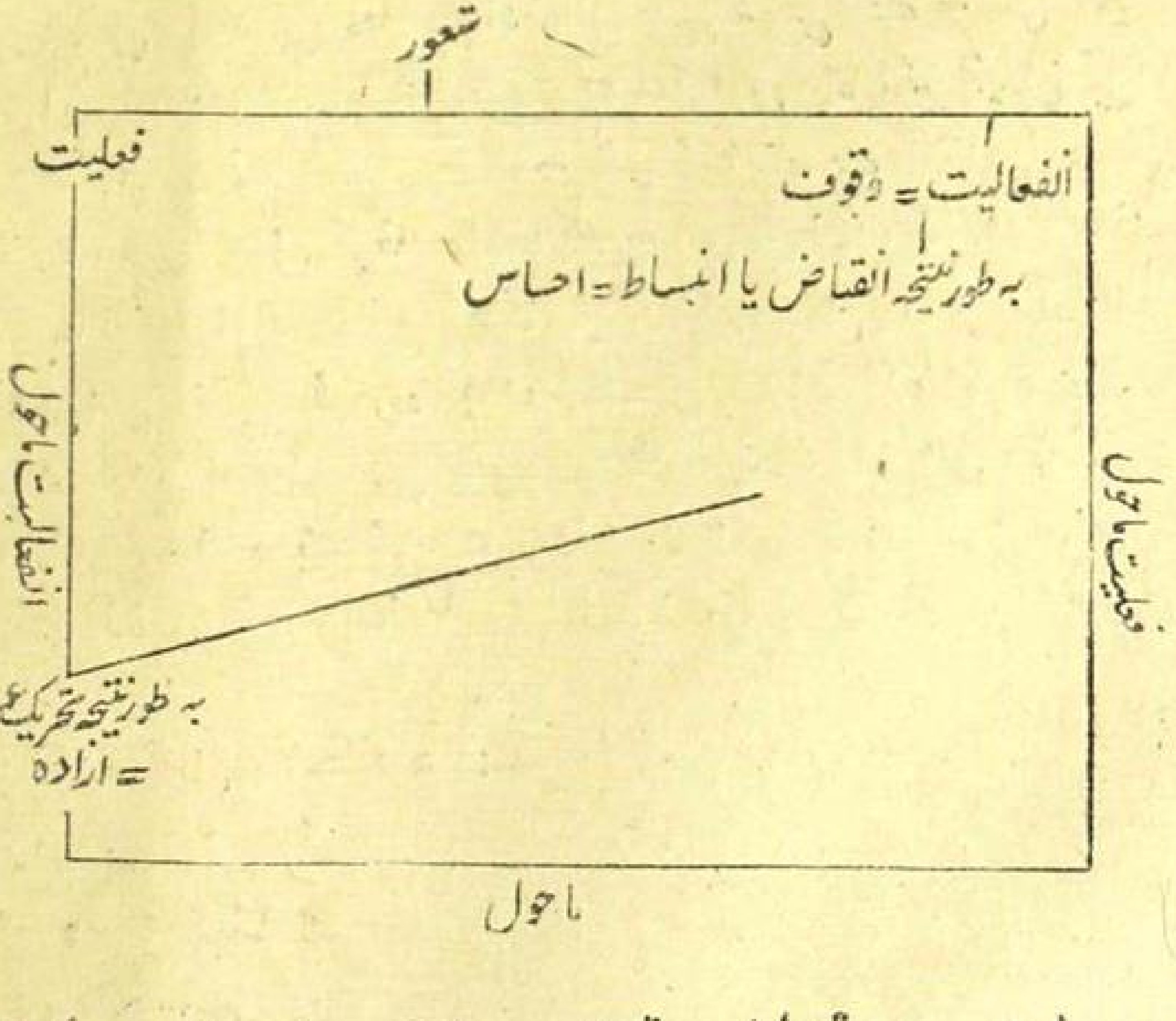
اب نقشۂ ذیل ملاحظہ ھو :—



ماھرین فن کے ایک گروہ کا کہنا ھے کہ وقوف، احساس پر موقوف و مشروط نہیں بلکہ خود اس کی شرط ھے اور اس پر مقدم ھے - یہ گروہ کہتا ھے کہ ماحول کی فعلیت کا سب سے پہلا اثر

انسان پر یہ پڑتا ھے کہ اس کو کسی قسم کا علم یا ادراک حاصل ھوتا ھے - یہ وقوف ھوا - اس سے اُس پر خوشگواری یا ناگواری کا اثر مرتب ھوتا ھے - یہ منزل احساس کی ھوئی - اب وہ اس احساس کو قائم رکھنا یا اُسے دفع کرنا چاھتا ھے، اس کا نام ارادہ پڑا -

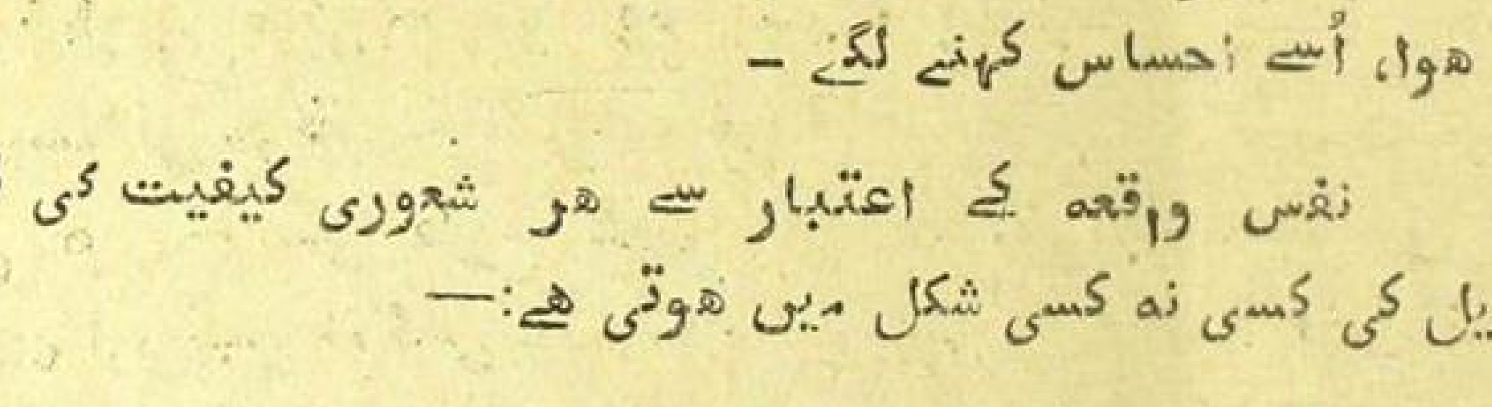
اس نظریے کو اس شکل کی مدد سے سمجھیے:—



اوپر جو تحلیل و تجزی عبارتوں اور نقشوں کے ذریعے سے کی گئی - یہ صرف فنی ضروریات سے ھے - یہ مراد نہیں، کہ وقوف، احساس اور ارادہ واقعتاً بھی ایک دوسرے سے بالکل الگ، تجربے میں آتے رھتے ھیں - عملاً ایسا ھونا ممکن نہیں - کوئی ارادہ ایسا ھو نہیں سکتا، جس میں وقوف و احساس کی

خفیف آمیزش بھی نہ ہو - کوئی وقوف ایسا تجربے میں آ نہیں سکتا، جس میں احساس و ارادہ کی جھلکیاں موجود نہ ہوں- کوئی احساس ایسا پایا نہیں جاتا، جو وقوف و ارادہ کے عنصروں سے یکسر پاک ہو—— شعور کی ہر نوعی کیفیت میں شعور کی دوسری نوعی کیفیتوں کا شمول کسی حد تک ضروری ہے - ہاں یہ ہے کہ اس میں ان دو کا جزو اتنا خفیف ہوتا ہے کہ فنی ضروریات کے لیے اسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے - اور جس کیفیت کا جزو نمایاں ہوتا ہے، اُسی سے اُس صنف شعور کو موسوم کرنے لگتے ہیں - جس کیفیت میں جزو غالب ارادہ کا ہوتا ہے، اس کا نام ارادہ پڑ گیا - جس میں پلہ وقوف کا بھاری رہا، اُسے وقوف سے تعبیر کردیا - جس میں حصۂ قوی احساس کا ہوا، اُسے احساس کہنے لگے -

نفس واقعہ کے اعتبار سے ہر شعوری کیفیت کی تصویر ذیل کی کسی نہ کسی شکل میں ہوتی ہے:—



اس کل کا نام وقوف — اس مجموعہ کا نام احساس — پورے دائرہ پر ارادہ کا اطلاق

نفس و شعور کے یہ تینوں عنصر عملاً اور واقعتاً کبھی ایک دوسرے سے بالکل خالی الگ موجود نہ ہوں نہ سہی، نفسیات میں اُن کا مستقل وجود فنی ضروریات اور سہولت

تقسیم کے لیے تسلیم کیا گیا ہے - اور یہ صحیح معنی میں اجزاے نفس نہیں، مفردات نفس ہیں —— رنگ کا وجود رنگین اشیاء سے خارج کسی نے دیکھا ہے؟ خوشبو، خوشبودار چیزوں سے الگ کس کے تجربے میں آئی ہے؟ تاہم رنگ و خوشبو، دونوں کا مستقل و ذاتی وجود سب ہی کو تسلیم ہے -

بچہ آپ کے سامنے گرتا ہے - پیر میں چوٹ آئی اور وہ چلاتا ہے —— چوٹ سے درد محسوس کرنا کھلی ہوئی مثال "احساس" کی ہے - لیکن ساتھ ہی وہ "جانتا" بھی ہے کہ یہ درد ہے - یہ بھی "جانتا" ہے کہ درد پیر میں ہے، ہاتھ یا سر میں نہیں - پیر پکڑ لیتا ہے، یا سہلانے لگتا ہے، یا ادھر اشارے کرتا ہے - یہ جان لینا، سمجھ لینا، پہچان لینا، سب وقوف کی فعلیت ہوئی - پھر یہ پیر کا پکڑ لینا یا سہلانے لگنا یا اور جسمانی حرکتیں کرنا ارادہ ہی کی ماتحتی میں اس سے سرزد ہوتی ہیں - اسی طرح شعور کی ہر مفرد کیفیت میں کچھ نہ کچھ اور کسی نہ کسی حد تک دوسری کیفیتیں بھی ضرور شامل رہتی ہیں -

شعوری کیفیتوں کی مثالیں بہت سی اوپر گزر چکیں - کچھ ضمناً اور کچھ مستقل - اُن پر غور کیا جائے تو ہر شعوری حالت میں صفات ذیل بھی نظر آئیں گی :—

(۱) پہلی چیز توجہ ہے - کسی شے کے شعور میں آنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اُدھر کسی حد تک متوجہ و مخاطب ہیں - جو شے سرے سے توجہ میں نہیں آئی، وہ شعور میں بھی نہیں آ سکتی -

(۲) پھر تمیز ہے - اگر دنیا کی ہر شے بالکل یکساں ہو، تو شعور سرے سے پیدا ہی نہ ہو - کائنات خارجی میں جو تبدیلیاں ہوئیں اور ہر لمحہ ہوتی رہتی ہیں، شعوری کیفیات بھی انھیں کے مطابق و ماتحت پیدا ہوتی رہتی ہیں - کسی شے کے زیر شعور آنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم نے اُسے دوسری موجودات سے کسی معنی میں اور کسی حد تک ضرور ممتاز اور علیحدہ کر لیا - تفریق و امتیاز کے بغیر شعور، شعور نہیں - دنیا میں اگر نور ہی نور ہوتا تو تاریکی کا کوئی مفہوم ہی ذہن میں نہ آتا -

(۳) شعوریت کا تیسرا عنصر تشابہ ہے - جو شے ذخیرۂ شعوری سے قطعاً بیگانہ و غیر متعلق ہے وہ شعور میں آ ہی نہیں سکتی - ضرور ہے کہ جو جدید شے ہمارے تجربے میں آئے اسے شعور کی سابق حالتوں سے کچھ نہ کچھ ربط و تعلق ہو - جس شے کو شعور سے کسی قسم کا ربط و تشابہ نہ ہوگا، اس کا وجود شعور کے لیے عدم کے مساوی ہے —— یہ قانون ظاہر ہے کہ بالکل ابتدائی اور اولین تجربوں کے بعد کے لیے ہے -

چوتھا باب

حس

میں کمرے کے اندر بیٹھا ہوا، غور و انہماک کے ساتھ سر جھکائے ہوے کچھ لکھنے لکھانے میں مشغول ہوں - اتنے میں ایک دوست لباس میں خوب عطر لگائے ہوے، بہت آھستہ قدم رکھتے ہوے، بلی کی سی چاپ کے ساتھ، کمرے میں داخل ہوتے ہیں - کچھ خوشبو سی معاً محسوس ہونے لگتی ھے - یہ تمیز ابھی نہیں ہوئی، کہ خوشبو کس شے کی ھے، اور آ کہاں سے رہی ھے، لیکن نفس خوشبو بہر حال محسوس ہو رہی ھے —— یہ مجرد خوشبو کا احساس، 'حس' کی ایک مثال ھے -

آپ دروازہ بند کئے غافل سو رھے ہیں، باھر سے کوئی کواڑ پر زور سے دستک دیتا ھے - آنکھ فوراً کھل جاتی ھے، لیکن اُس لمحہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس نے اور کیوں کر جگایا اور سمجھ میں آئے کیسے - فی الفور آپ کا پورا شعور بیدار بھی تو نہیں ہوا - محض ایک تیز آواز ھی کا احساس تو ہوا تھا —— یہ حس کی دوسری مثال ہوئی -

ہم ایک جادو بیان مقرر کی تقریر سننے میں ھمہ تن گوش ہیں - ایک کیڑا ھمارے ھاتھ پر رینگنے لگا، اور معاً ھاتھ کی جلد پر ایک ناگوار سی کیفیت محسوس ہونے لگی - ابھی کچھ پتا نہیں چلتا کہ ناگواری کس شے سے یا کس طریقے پر ہو رہی ھے، اور کیسے پتا چلے، کان تو تمام تر تقریر کی

طرف لگے ہوئے ہیں —— اس مطلق ناگواری کا احساس بھی حس ہی کی ایک قسم ہوئی -

ان مثالوں نے واضح کردیا کہ حس شعور کی بسیط ترین کیفیت کا نام ہے - اس میں کسی قسم کی تشخیص و تعیین نہیں ہوتی - اور اس میں مزید تحلیل و تجزی کی گنجائش بھی اب اسی طرح ممکن نہیں، جس طرح کیمیائیات (کیمسٹری) میں ایٹم یا ذرہ کی -

حس سے ملتی جلتی کیفیت ادراک کی ہے - فرق یہ ہے کہ حس میں تعین و تشخص نہیں ہوتا - اِدراک معین و مشخص ہوتا ہے - —— آواز شعور میں جب تک محض آواز ہے حس ہے - اور جب اس قسم کے تعینات پیدا ہوگئے کہ آواز فلاں شےکی ہے، فلاں سمت سے آرہی ہے - اتنے فاصلے کی ہے، اتنے زور کی ہے، فلاں قسم کی ہے - تو اب وہی آواز نفسیات کی زبان میں، اِدراک کہلائے گی - گویا دوسرے لفظوں میں حس نام ہے ایک مبہم، غیر متعین، غیر مشخص اِدراک کا -

یہ معلوم ہے کہ نفس کی بالکل ابتدائی حالت انفعالی ہوتی ہے - خارج کی تاثیرات سے کچھ نقش اگر نفس پر جمتے ہیں، معاً جو شعوری کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہی حس ہے - نفس اگر اپنی فعلیت سے اُس میں کچھ ترمیم، تالیف، حذف و اضافہ کرنے لگا، تو وہی حس ادراک بن جائے گا - لیکن جب تک وہ کیفیت تمام تر انفعالی ہے، یعنی فعلیت نفس کے توسط کے بغیر محض خارجی تاثیرات سے شعور میں از خود پیدا ہوگئی ہے، اس پر حس کا اطلاق رہے گا -

لیکن حس کی اس تعریف کے ساتھ عملی دنیا میں اس کا وجود ممکن نہیں ۔ عملاً کیا ہمارے تجربے میں کوئی ایسی آواز آسکتی ہے جو نہ بلند ہو نہ پست، نہ ناگوار ہو نہ خوش گوار، نہ قریب کی ہو نہ دور کی ؟ کوئی ایسا نظارہ ممکن ہے جو نہ رنگ کا ہو نہ جسامت کا نہ طول کا نہ عرض کا نہ سطح کا نہ عمق کا ؟ — جواب ہر شخص اپنے تجربے سے نفی میں دے گا، اور صحیح دے گا ۔ عملاً ہمارے شعور میں جتنی بھی کیفیتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں، اُن میں کوئی بھی خالص اور بلاآمیزش و اِختلاط نہیں ہوتی ۔ یہ کیفیت دوسری کیفیتوں کے ساتھ کسی نہ کسی حد تک ترکیب و آمیزش ضرور رکھتی ہے ۔ تو عملی زندگی میں جس حس کی تعریف ابھی یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ بالکل غیر متعین اور غیر مشخص ہوتا ہے، اُس کا تجربے میں آنا ممکن نہیں ۔

لیکن جب یہ ہے تو پھر آخر یہ نفسیات والے اس کا وجود ہی کیوں فرض کئے ہوے اور اسے اپنی سربفلک عمارت کا بنیادی پتھر ہی کیوں قرار دیے ہوے ہیں ؟ سوال کے جواب میں پہلے ایک اچٹتی سی نظر ذرا دوسرے علوم و فنون کے مبادی پر کرلی جائے ۔ ہندسہ (جیو میٹری) تو بڑا باضابطہ اور پختہ علم ہے، اس کا سارا سرمایۂ حیات ”نقطہ“ ہے ۔ حالانکہ خارج میں نقطہ کا وجود نہ آج تک ہوا ہے نہ آئندہ کبھی ہونے کا ۔ علم الحساب (ارتھمیٹک) کی ساری کائنات ”عدد“ ہے ۔ لیکن معدود سے الگ نفس ”عدد“ کا وجود خارج کی دنیا میں کہیں ہے یا کبھی ہوگا ؟ طبعیات، کیمیائیات، سب

کی آخری بنیاد جاکر موجود نہیں، مفروض ہی چیزوں پر پڑتی ہے! —— معلوم یہ ہوا کہ ہر علم و فن

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کے مصداق، کچھ ایسی چیزوں کا وجود بالکل آغازکار میں، فرض ضرور کرلیتا ہے، جن کا وجود خارج میں نہیں ہوتا ۔ کہ اس سے فن کے سمجھنے میں سہولت رہتی ہے - ظاہر ہے کہ مرکبات کے مقابلے میں مفردات زیادہ آسان اور کم پیچیدہ اور قریب‌الفہم ہوتے ہیں - مسائل بھی جب مفردات کی شکل میں پیش کئے جاتے ہیں تو علوم کے انضباط میں بڑی آسانی پیدا ہوجاتی ہے، بلکہ اگر مفردات کا وجود نہ تسلیم کرلیا جائے، تو کوئی علم منضبط و مدون بھی نہ ہونے پائے —— نفسیات نے اسی اصل پر حس کا وجود فرض کیا ہے - شعوری زندگی میں اس کا مستقل نہ پایا جانا ہو نہ سہی، کسی ایسی بسیط و مفرد کیفیت کا فرض کرلینا بہر حال ضروری تھا، جس پر تمام مرکب کیفیات تحلیل ہو کر بالآخر ٹھہر سکیں اور وہی حس ہے -

حس کی قریب‌ترین شکل کے صحیح معنی میں تجربے انسان کو زندگی کے صرف ابتدائی چند گھنٹوں (زیادہ سے زیادہ چند دن کہ لیجیے) ہی میں ہوسکتے ہیں - جب بچے کے لیے دنیا تمامتر ایک نئی اور انوکھی چیز ہوتی ہے-اور روشنی، گرمی، آواز وغیرہ کا ہر تجربہ اُس کے لیے بالکل نیا ہوتا ہے نفس اُس وقت اپنی سطح سادہ رکھتا ہے، ترکیب و تالیف سے ناآشنا ہوتا ہے - اُس وقت نفس پر جو نقش باہر سے

آکر جمتے ھیں' بس وھی صحیح معنی میں حس کہے جا سکتے ھیں - باقی بالکل بچپن کے بعد پھر انسان کو اگر اپنی شعوری زندگی میں حس کا کبھی تجربہ ھوسکتا ھے تو صرف اُن چند لمحوں میں جب وہ غشی سے ھوش میں آنے یا بہت گہری نیند سے یک بیک بیدار ھونے لگتا ھے - یوں چند لمحوں میں شعور اپنی خفی سے خفی حالت میں ھوتا ھے - تعین و تشخیص' ترکیب و تالیف کی قابلیت کچھ یوں ھی سی رکھتا ھے - اس لیے حس کی خالص اور بے ترکیب کیفیت پیدا ھو سکتی ھے -

حس کا وجود مستقل تسلیم کرنے کے بعد اب اس کی شکلوں اور قسموں کو دیکھنا ھے -

(۱) ایک حس وہ ھے جس سے رنگ اور روشنی شعور میں آتی ھے - نور و ظلمت میں' اور مختلف رنگوں کے درمیان امتیاز ھوتا ھے - اس کا نام حس باصرہ ھے -

(۲) دوسرا حس وہ ھے' جس سے آواز شعور میں آتی ھے - اسے حس سامعہ سے موسوم کرتے ھیں -

(۳) ایک حس اس کام کے لیے ھے کہ خوشبو اور بدبو کی تمیز کرسکے - اسے حس شامہ کہتے ھیں -

(۴) ایک حس ایسا ھے کہ جو کھانے پینے کی چیزوں کا مزا بتاتا ھے' اس کا نام حس ذائقہ ھے -

(۵) ایک حس اُن کیفیات کے لیے ھے جن کا تعلق جسموں کو چھونے یا مس کرنے سے ھے - اِسے حس لامسہ کہتے ھیں -

قدیم فلسفی و حکیم انھیں حواس خمسہ کے قائل تھے - جدید ماہرین نفسیات کہتے ھیں کہ چند کا اضافہ اور کرنا چاھیے - یعنی

(٦) لامسہ کے علاوہ ایک مستقل حس ایسا بھی قرار دینا چاھیے، جو گرمی، سردی، درد، دباؤ، کھجلی، گدگدی، وغیرہ جلد کی جملہ کیفیتوں کو شعور میں لائے - اس کا نام حس جلدی رکھا گیا ھے -

(٧) ایک عنوان حس اور قائم کرنا چاھیے - جس کے ماتحت اشیاء کے وزن، اُن کی سختی نرمی، قوت مزاحمت، اور اعضاے جسم کی حرکت کی کیفیات کا علم ہوتا ھے - اس کے لیے حس عضلی کی اصطلاح قرار پائی ھے، کہ ان سب کا تعلق عضلات جسم سے ھے - (قدیم فلسفی ان دونوں حسوں کو حس لامسہ ھی کے تحت میں رکھتے تھے)

(٨) لیکن تقسیم جامع و مکمل اب بھی نہیں ہوئی - ابھی بہت سی مفرد اور بسیط کیفیتیں باقی رہ گئی ھیں، جن کی تحلیل کسی اور حس میں ممکن نہیں - مثلا بھوک، پیاس، نیند، خستگی، شکم‌سیری، نفخ شکم، متلی وغیرہ - ان سب کے لیے ایک مجموعی نام حس آلي یا حس عضوی تجویز ہوا ھے -

جو پانچ حواس پرانے چلے آتے ھیں، اُن میں سے ہر ایک کے لیے ایک علیحدہ عضو یا جسمانی آلہ موجود ھے - بصارت کے لیے آنکھ، سماعت کے لیے کان، شامہ کے لیے ناک، ذائقہ کے لیے زبان، لمس کے لیے جلد - نئے تین حواس میں

سے حس جلدی کا آلہ بھی جلد ھی مانا گیا ھے - اور حس عضلی کے لیے عضلات جسم میں - لیکن حس آلی کے لیے کوئی مخصوص و متعین عضو نہیں - اسی لیے محض نفسیین اس طبقہ کی کیفیتوں کو حس کے دائرے ھی میں نہیں رکھتے - اور بھوک، پیاس، نیند وغیرہ کے لیے بجاے حسیات کے اشتہآت کا عنوان موزوں‌تر قرار دیتے ھیں -

حس وجود میں کیوں کر آتا ھے ؟ اس کا پورا جواب مشکل ھی ھے جیسا کہ ھر بسیط کیفیت کا حال ھے - صرف اتنا کہا جاسکتا ھے کہ اعصاب میں ایک تحریک پیدا ھوتی ھے، اور وہ جب شعور میں منتقل ھوجاتی ھے، تو اُسی کا نام حس پڑ جاتا ھے - گویا حس اگرچہ بذات خود تمامتر ایک نفسی و شعوری کیفیت ھے، تا ھم اُس کی حیثیت ایک مادی و عضویاتی کیفیت کے مثنیٰ کی ھے - اس لیے اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے اس کے عضویاتی جزو کو خیال میں رکھنا ضروری ھے - اسے اصطلاح میں مہیج کہتے ھیں —— مہیج کے معنی ھیں وہ چیز جو ھیجان بن جائے یا برانگیختی پیدا کرے - تو جو شے ذرات عصبی میں برانگیختگی یا ھیجان پیدا کردیتی ھے اس کو مہیج سے موسوم کرتے ھیں - اور ھیجان و برانگیختگی کی جو مادی کیفیت اس سے پیدا ھوتی ھے اُس کا اصطلاحی نام تہیج ھے -

ایک بندوق سر ھوگئی، اور اُس کی آواز ھمیں سنائی دی - بندوق کے سر ھونے سے ھوا میں ایک خاص قوت کے

تموجات پیدا ہوئے، اُن کا تھپیڑا آکر کان کی اندرونی جلد پر لگا - اس کا نام تہیج خارجی یا تہیج مادی ہے - اس سے عصب سامعی یوں متاثر ہوا کہ اُس کے ذروں یا خلیوں میں ایک خاص طرح کی سوزش پیدا ہوگئی - اس ارتعاش کو تہیج داخلی یا تہیج عصبی کہتے ہیں - یہ سوزش جب دماغ کے اس حصے تک پہنچی جو مرکز سماعت ہے تو یہی جسمانی و عصبی ارتعاش ایک نفسی یا شعوری کیفیت میں تبدیل ہوگیا - اسی کا نام سننا یا سماعت کرنا ہے -

اس مثال سے یہ بات روشنی میں آگئی، کہ ہر حس کو تین زینے طے کرنے ہوتے ہیں :—

(۱) ماحول میں تحریک - یا تہیج خارجی یا مادی —— اس پر بحث کرنا طبیعیات کا موضوع ہے -

(۲) اعصاب میں لرزش و ارتعاش - یا تہیج داخلی یا عصبی —— اس کی بحث فعلیات میں آتی ہے -

(۳) ایک نفسی و شعوری کیفیت - یا حس - یہ البتہ براہ راست نفسیات کے دائرے کی چیز ہے -

ابھی گزر چکا ہے کہ حس کی آٹھ قسمیں قرار پائی ہیں - لیکن یہ تقسیم ہے کس بنیاد پر ؟ اِس بنیاد پر کہ ہر آلۂ حس ایک ہی قسم کے تہیجات سے متاثر ہوتا ہے، اور باقی سے غیر متاثر رہتا ہے - آنکھ روشنی کی موجوں سے متاثر ہوتی ہے، کان ہوا کی موجوں سے، و قس علیٰ ہذا - یہی سبب ہے کہ آنکھ زبان کا کام نہیں دے سکتی، اور زبان آنکھ کی جانشینی نہیں کر سکتی —— گویا تنوع حواس کی بنیاد تنوع جذبات ہے -

یہ تو ہوا - لیکن یہ بھی تو ہے کہ آوازیں آوازیں سب یکساں کب ہوتی ہیں؟ منظر منظر سب ایک تو نہیں ہوتے - جن حسوں کی اصل ایک ہے، نوعیت ایک ہے، پھر اُن کے افراد میں باہم فرق و اختلاف کیوں اور کس بنا پر؟ —— جواب یہ ہے کہ ہر مہیج اپنی ذات کے ساتھ کچھ صفات بھی تو رکھتا ہے - یہ صفات و خصوصیات کم بھی ہوتے ہیں زاید بھی، ہلکے بھی گہرے بھی- اور اِسی فرق صفاتی کے مطابق و ماتحت ایک ہی اصل و نوع کے حسیات ایک دوسرے سے الگ اور مختلف ہوتے ہیں -

یہ صفات و خصوصیات کیا ہیں، اب یہ بھی جان لیجیے -

(۱) قوت - ہر مہیج ایک خاص درجے کی قوت رکھتا ہے، دوسرے مہیجات سے مختلف - اور درجۂ قوت ہی کے لحاظ سے ہم حکم لگاتے ہیں کہ روشنی تیز ہے یا دھیمی - فلاں رنگ شوخ ہے اور فلاں ہلکا - یہ آواز بلند ہے، وہ آواز پست-کوئی چیز سخت ہے کوئی چیز نرم -

(۲) وضاحت - ہر مہیج کے شعور میں آنے کے لیے ایک خاص درجے کی وضاحت یا صفائی بھی ضروری ہے - اور اِس درجۂ وضاحت ہی کے فرق کی بنا پر ہم فیصلہ کرتے ہیں، کہ یہ منظر نمایاں و روشن ہے اور وہ دھندلا - فلاں آواز صاف ہے، فلاں گنجلک -

(۳) مدت - ہر مہیج عامل و موثر ایک خاص مدت ہی تک رہتا ہے - اور اِس عمل و اثر کے مدت قیام ہی کے لحاظ سے

ہم اِس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ فلاں شے جلد ختم ہوگئی، فلاں دیر تک رہی۔ یہ چیز عارضی نکلی، وہ چیز دیرپا۔

اُوپر کی صراحتوں سے یہ تو معلوم ہی ہو چکا کہ حس اُس شعوری کیفیت کا نام ہے جو خارجی محرکات پر مشروط اور اُن کی معلول ہوتی ہے، لیکن محرکات خارجی ٹھہرے بیشمار۔ کائنات خارجی میں ہر لحظہ اور ہر آن جو تحریکات ہوتی رہتی ہیں، کون اُن کا احاطہ کرسکتا ہے؟ حالانکہ حسیات تو بیشمار و غیرمحدود نہیں، بلکہ شمار و حد کے اندر آجانے والی چیزیں ہیں۔ تو گویا بہت سی قسمیں محرکات خارجی کی ایسی ہوئیں جنہیں نفس قبول نہیں کرتا۔ اور اُن کی مطابقت اور ماتحتی میں کوئی حس وجود میں نہیں آتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ محرکات خارجی کی استعداد قبول نفس میں محدود ہے۔ اور چونکہ استعداد قبول ہی محدود و معین ہے، اس لیے لامحالہ حواس بھی محدود و معین ہی ہیں ——— غیرمحدود حواس رکھنے والا انسان آج تک نہیں پایا گیا۔

انسان کے پاس جو حواس ہیں وہ سب کے سب کیڑوں مکوڑوں میں موجود ہیں۔ بعض حواس جو اُن میں پائے جاتے ہیں، اُن سے انسان محروم ہے۔ اُلو، چمگادڑ، شیر، بلی وغیرہ کئی قسم کے حیوان ایسے ہیں جو تاریکی میں بخوبی دیکھ لیتے ہیں۔ انسان کی آنکھ ایسی حالت میں بےکار رہتی ہے۔ بعض جانور خاص قسم کی خوشبوئیں سونگھ لیتے ہیں، انسان نہیں سونگھ پاتا ——— نظام فطرت میں کوئی شے بےقاعدہ

اور بےاُصول نہیں - یہاں قاعدہ یہ معلوم ہوتا ہے، کہ جو تحریکیں جس نوع کے لیے کارزار حیات میں مفید ثابت ہوئیں اُن کے قبول کرنے کی استعداد و صلاحیت اس نوع میں آگئی - اور باقی نوعیں اس صلاحیت سے محروم رہیں - شاعرانہ زبان میں یوں سمجھیے -

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

اس قاعدے کے مطابق کائنات خارجی میں تحریکات کا شعوری تاثر یا حس کارزار حیات میں حیات انسانی کے حق میں مفید پڑا، انھیں کو قبول کرنے، محسوس کرنے کی صلاحیت انسان میں پیدا ہوگئی - باقی ساری تحریکات اِس کے لیے غیر محسوس یا اُس کے دائرۂ حس و شعور سے خارج رہیں -

گھڑی کو صحیح طور پر چلانے کے لیے کافی نہیں کہ اُسے روزانہ ایک وقت معین پر کوک دی جایا کرے - بلکہ یہ بھی لازمی ہے کہ کوک صحیح اندازے کے ساتھ دی جائے - یعنی کمانی کو ایک مخصوص و معین تعداد میں گھمایا جائے - اگر کوک اس معین تعداد سے بہت کم رہی یا بہت زیادہ ہوگئی، تو نتیجہ دونوں صورتوں میں یہ ہوگا کہ گھڑی چل نہ سکے گی ———
یہی حال شعور کی گھڑی کا ہے - مہیج اگر غیرمعمولی طور پر قوی یا غیرمعمولی طور پر ضعیف ہے، تو دونوں صورتوں میں کوئی کیفیت شعوری، کوئی حس نہ پیدا ہونے پائے گی - بہت سی آوازیں جو فضاے کائنات میں پیدا ہوتی رہیں، لیکن انسان

کے لیے غیر مسموع رہتی ہیں، بہت سے منظر جو وجود میں آتے رہتے، لیکن انسان کے لیے غیر مرئی رہتے ہیں، اسی قبیل سے ہوتے ہیں - یہیں سے یہ قاعدہ ہاتھ آیا، کہ انسان میں حس پیدا ہونے کے لیے اسی قدر کافی نہیں کہ محرک خارجی یا مہیج افسان کے لیے حس آفریں قسم کا ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ھے کہ مہیج قوت اور مقدار کا بھی ایک خاص درجہ رکھتا ہو - اگر اس درجے سے کمی یا بیشی ہوگی تو شعور غیر متاثر رہے گا -

روشنی اگر تیز ھے تو صاف دکھائی دے گی، اگر مدھم ھے تو دھندلا دکھائی دیتا ھے - آواز اگر پست ھے تو بہ دقت سنائی دیتی ھے، اگر بلند ھے تو سننے میں آسانی ہوتی ھے ——— معلوم یہ ہوا کہ مہیج کی قوت اور حس کی قوت کے درمیان ایک خاص تناسب رہتا ھے - جس درجے اور قوت کا مہیج ہوتا ھے، اُسی کی تناسب سے آلات حواس بھی متاثر ہوتے ہیں - شعوری کیفیت جس قسم اور جس شعبے کی بھی ہو، لازمی ھے کہ شعور اور ماحول کے درمیان ایک خاص تناسب ہو - حس شعور ہی کی ایک قسم ھے، اور وہ اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں -

کسی بچے کی پشت پر ایک من کا وزن بار کر دیجیے، اُسے جس قدر اذیت ہونا ھے ہوجائے گی - اُس کے بعد اُس کے لیے ڈیڑھ من، دو من، چار من سب یکساں ہیں - مقدار یا وزن جو مہیج ہیں، اُن میں اضافے سے بچے کی تکلیف یا حس درد میں کوئی اضافہ نہ ہوگا ——— تیز برقی لمپ کی روشنی میں

اگر ہم کوئی کتاب پڑھ رہے ہوں، اور ایک معمولی تیل کا لیمپ قریب لے آیا جائے، تو ہمیں کچھ زیادہ اُجالا محسوس نہ ہوگا۔ دن دوپہر کی روشنی میں ہم پڑھ رہے ہوں، اور ایک شمع لے آئی جائے، تو اُجالے میں ہمیں مطلق فرق نہ محسوس ہوگا ــــ اوپر یہ عام قاعدہ ابھی بیان ہوا تھا کہ حس کی قوت مہیج کی قوت کے متناسب و مطابق رہتی ہے۔ اس میں قید لگانے کی ضرورت پڑ گئی۔ اب قاعدہ یوں سمجھیے، کہ حس کی قوت ایک حد و مقدار خاص تک مہیج کی قوت کے متناسب رہتی ہے۔ اس حد و مقدار کے بعد مہیج کی قوت و مقدار سے حس بالکل غیر متاثر رہتا ہے۔

ہم سنتے اس وقت تک ہیں جب تک آواز کے تموجات ہوا میں قائم ہیں۔ سونگھتے اُسی وقت تک ہیں جب تک ذرے شامہ کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد نفس حس فنا ہوجاتا ہے۔ صرف اُس کے نقش حافظہ میں باقی رہ جاتے ہیں۔ اِن مشاہدات سے قاعدہ یہ بنا کہ مہیج کی مدت قیام اور حس کی مدت قیام ایک رہتی ہے۔ جتنی دیر تک مہیج قائم رہتا ہے، حس بھی قائم رہتا ہے۔ اور جوں ہی مہیج ہٹا، حس بھی مٹ جاتا ہے۔ بعد کو نفس میں جو کچھ رہ جاتا ہے وہ اس حس کی صرف یادداشت ہوتی ہے نہ کہ خود حس۔ البتہ بجلی کی چمک جو انتہائی سرعت کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے۔ لیکن اس کا حس ایک آدھ سکنڈ تک باصرہ کو متاثر رکھتا ہے، بہ ظاہر اس قاعدے میں ایک استثناء ہے۔ عجب نہیں جو اس کا سبب مہیج کی غیر معمولی قوت ہو۔

آخر میں ایک سوال یہ رہا جاتا ھے کہ ایک ھی اصل و قسم کی حسیات میں فرق کرنے والی شے اگر مہیجات کے درجات قوت و وضاحت و مدت قیام کا اختلاف ھے - تو پھر یہ کیا ھے کہ آلۂ حس بھی ایک' اور مہیج بھی ایک' پھر بھی حسیات باھم مختلف قسم کے حاصل ھوتے ھیں؟ —— کان ایک ھی آلۂ حس ھے' مہیج یعنی آواز یا ھوا کا تموج بھی ایک ھی - تاھم اسی کان اور اسی آواز سے شور و غل کا بھی احساس ھوتا ھے' نغمہ و ترنم کا بھی' اور معمولی گفتگو کا بھی!

جواب یہ ھے کہ مہیج گو صورتاً ایک ھے' یعنی آواز' لیکن اس کی اندرونی ساخت' ترکیب ھر صورت میں جداگانہ ھے - اس لیے حقیقتاً تہیج ایک نہیں' تین ھوے - شور و غل میں تموجات ھوائی منتشر 'متفرق و غیر منظم ھوتے ھیں - گفتگو میں مرتب و منظم ھوتے ھیں - اور نغمہ میں نظم و ترتیب کے ساتھ اُتار چڑھاؤ بھی ھوتا ھے ——— مہیج کی اِن صفات و خصوصیات کی تعیین و تفصیل ایک جداگانہ جدید علم سے متعلق ھے - اس کو اصطلاح میں طبیعیات نفسی (سایکو فزکس) کہتے ھیں - نفسیات میں ان کا ذکر محض سرسری' اور "بہ سبیل تذکرہ" ھی آسکتا ھے -

پانچواں باب

عادت کی طاقت

عادت کے لفظ سے ہم آپ سب ہی واقف ہیں' بہتر ہے کہ اس کی ماہیت و حقیقت سے بھی کچھ واقفیت ہو جائے۔

لفظ "عادت" عربی کے مادہ "عود" سے بنا ہے۔ جس کے معنے ہیں لوٹنا' پھیرنا' ایک بات بار بار کئے جانا' گھوم پھر کر وہی فعل صادر ہونا' اِسی کا نام عادت ہے ــــــ ڈیوک آف ولنگٹن مشہور برطانوی جنرل' ایک فوجی' عملی آدمی تھا' مبالغہ بیانی اور لفظ آرائی کے فن سے بیگانہ۔ عادت کی طاقت کا مشاہدہ کر کے وہ ایک بار کہہ اُٹھا کہ "عادت کو طبیعت ثانی کہتے ہیں! ارے اُس کی طاقت تو طبیعت سے دس گنی زاید ہے"

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی لفظ یا فقرہ بعض لوگوں کا تکیہ کلام یا سخن تکیہ ہو جاتا ہے۔ جب زبان چلے گی' تو بے محل اور بے موقع وہ تکیہ کلام بھی ضرور زبان پر آجائے گا۔ محفل میں یہ ہنسے جاتے ہیں' بنائے جاتے ہیں' خود اپنی جگہ بار بار شرمندہ ہوتے ہیں۔ لیکن مجال کیا کہ وہ مہمل و مضحک سخن تکیہ اُن کا ساتھ چھوڑ دے ــــــ یہ ایک کرشمہ عادت کا ہے۔

بعضوں کی زبان پر گالیاں چڑھ جاتی ہیں۔ اب بزرگوں کا مجمع ہے۔ ثقہ' سنجیدہ' شریفوں کی محفل ہے' یہ

اپنی زبان ہزار سنبھالتے ہیں، اپنی طبیعت لاکھ روکتے ہیں - لیکن بے مروت نظامِ عصبی زرا اُن کی پروا اور مروت نہیں کرتے، جن لفظوں کو یہ دبانا چاہتے ہیں، وہی بے اختیار زبان پر آئے جاتے ہیں —— اُسی عادت کی طاقت کا ایک نمونہ !

کہتے ہیں کہ ایک برطانوی سپاہی عرصۂ دراز کی فوجی ملازمت کے بعد پنشن لے کر وطن واپس آیا - ایک روز غسل کے لیے غسل‌خانہ میں گیا، اور کچھ دیر بعد بڑی جھنجھلاہٹ کے ساتھ باہر نکل آیا - بیوی بولی، کہ خیریت ہے - کہا "خیریت کی ایسی تیسی، غسل نہ ہونا تھا نہ ہو پایا" - "تو آخر بات کیا ہوئی" بیوی نے گھبرا کر پوچھا - "بات کیا ہوتی، ایک کمبخت اطالوی گلی میں کھڑا ہوا ارگن بجا رہا ہے - اِدھر میں نے ٹب میں غوطہ لگانے کے لیے قدم رکھا کہ اُدھر اُس نے بادشاہ سلامت والا فوجی ترانہ چھیڑ دیا، عمر بھر کی عادت کو کہاں چھوڑ آؤں، فوراً ہر بار مجھے ادب قاعدے کے ساتھ سیدھا کھڑا ہو جانا پڑتا تھا" —— جی اور کیا - عادت کا تسلط کیا کوئی دلگی ہے !

عقل، عقل، جس پر آج اتنا ناز کیا جا رہا ہے، خود وہ کیا ہے - عادت ہی کی، تو ایک صورت ہے - جو عادت چاہیے ڈال لیجیے، بس وہی رفتہ رفتہ عقل و فہم بن جائے گی - جبھی تو ہمارے حکیم شاعر حالی فرما گئے ہیں -

دیکھ عادت کا تسلط، میں نے عادت سے کہا
گھیر لی عقلِ صواب اندیش کی سب تو نے جائے

ھنس کے عادت نے کہا کیا عقل ھے مجھ سے الگ
میں ھی بن جاتی ھوں ناداں رفتہ رفتہ عقل و رائے

انسان اگر نام ھے حیوان ناطق کا، تو اس کی صفت حیوانیت اور صفت نطق دونوں کا سب سے بڑا ذمہ‌دار عضو کوئی ایک عضو نہیں، بلکہ ایک نظام اعضاء ھے - اور اصطلاح میں اس کا نام نظام عصبی ھے - جسم انسانی میں نظام اعضاء ایک نہیں، کئی ایک موجود ھیں - نظام تنفس، نظام تغذیہ، نظام دوران خون، وغیرہ - اور سب اپنی اپنی جگہ عضو رئیس کا حکم رکھتے ھیں - لیکن نظام عصبی ان سب رئیسوں کا رئیس اور ان سے افضل و اعلی ھے - حیات انسانی کا کہنا چاھیے کہ اِسی پر اِنحصار ھے - اور اس کا اصلی کام جسم کے مختلف حصوں اور قوتوں میں نظم و ربط قائم رکھنا، ایک کو دوسرے سے مرتبط رکھنا ھے —— فرض کیجیے کسی ماھر فن ڈاکٹر نے گوشت و خون، پوست و استخوان، دل و دماغ، معدہ و جگر، جوڑ جاڑ کر انسان کا ایک قالب تیار کر دیا، لیکن نظام عصبی کی فکر نہ کی، تو قلب موجود ھے، لیکن دوران خون ایک لمحے کے لیے بھی نہ ھو سکے گا - پھیپھڑے موجود ھیں، اور فضا بھی تازہ ھوا سے معمور ھے، لیکن سانس ایک بار بھی جا نہ سکے گی - معدہ صحیح و سالم ھے، غذا بھی کسی خارجی آلہ سے اُس کے اندر پہنچ گئی ھے - لیکن عمل ھضم کا سلسلہ شروع ھی نہ ھو سکے گا - عضلات الگ الگ سب موجود ھیں، لیکن مصنوعی ڈھانچا جس وضع پر کھڑا کر دیا گیا ھے، اُس سے سرمو جنبش

کرنے کی قدرت مفقود ہے - غرض نظامِ عصبی اگر موجود نہیں، تو انسانیت کے اور سارے اجزاء موجود سہی، اُن پر انسان کا اطلاق کسی طرح نہ ہو سکے گا ---- گویا مکان کے لیے اینٹ، پتھر، چونا، مٹی، لکڑی، سارے مسالے کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہے، لیکن کوئی معمار یا کاریگر موجود نہیں، جو ان متفرق و منتشر اجزاء میں ترتیب و ترکیب پیدا کرسکے، تو مکان یا عمارت کا اطلاق کبھی بھی اُس ڈھیر پر نہ ہو سکے گا -

اس نظام عصبی کی پہلی دو بڑی تقسیمیں یہ ہیں :—

(۱) نظام عصبی محیطی - یہ نظام عصبی کا وہ حصہ ہے جو جسم کے ہر ہر گوشے میں محیط ہے - وہاں سے مرکز تک تاثرات پہنچاتا ہے، اور مرکز سے تحریکات وہاں تک لے جاتا ہے -

(۲) نظام عصبی مرکزی - یہ نظام عصبی کا وہ حصہ ہے جو بہ طور مستقر یا صدر مقام کے ہے - اسی پر عام تاثرات کی انتہا ہوتی ہے اور اسی سے تمام تحریکات کی ابتدا -

اب اِن دو بڑی تقسیموں کے ماتحت خود کئی کئی تقسیمیں ہیں - چنانچہ مرکزی نظام کے اہم اور بڑے حصے دو ہیں:—

(۱) دماغ - یعنی مغز جو کاسۂ سر کے اندر بند ہے [اور اس کی بھی کئی جزوی تقسیمیں ہیں - مخ - مخیخ وغیرہ - لیکن مبتدی طلبہ اور عام ناظرین کو اتنی تفصیل سے سروکار نہیں]

(۲) نخاع - یعنی فقرات پشت (ریڑھ کی کڑیوں) کے

اندر کا گودا' جسے عام بول چال میں حرام مغز کہتے ھیں -

اسی طرح نظام محیطی بھی دو قسم کے اعصاب پر مشتمل ھے :-

(۱) اعصاب حسی - یعنی وہ اعصاب جو جسم کے اطراف و جوانب سے پیام عصبی مرکزوں تک لے جاتے ھیں - (ان درآور پیاموں کو اصطلاح میں "تاثرات" کہتے ھیں)

(۲) اعصاب حرکی - یعنی وہ اعصاب جو عصبی مرکزوں سے پیام جسم کے اطراف و جوانب تک پہنچاتے ھیں (ان برآور پیاموں کا اصطلاحی نام "تحریکات" ھے)

یہ دونوں قسم کے اعصاب خوردبینی جسامت کے' نہایت باریک سفید دھاگے سے ھوتے ھیں -

تار کے ایک سرے کو ھلائیے تلائیے' تو سارے تار میں دوسرے سرے تک ایک لرزش سی پیدا ھوجائے گی' اور تار گویا لہرا جائے گا - ایسی ھی کیفیت اعصاب حسی میں کسی تحریک خارجی کے اثر سے ھوجاتی ھے - اور اِن میں لرزش پیدا ھوجاتی ھے - اصطلاح میں اس کا نام تہیج ھے - یہ تہیج جب مرکزی نظام عصبی دماغ یا نخاع سے جا ٹکراتا ھے' تو وھاں معاً اس "درآمد" کے مقابلے میں ایک عمل "برآمد" بھی وجود میں آجاتا ھے - یعنی اعصاب حسی کے اس تاثری تہیج کے مقابلے میں ردعمل کے طور پر اعصاب حرکی میں ایک تہیج تحریکی پیدا ھوجاتا ھے - اور اعصاب حرکی اس تہیج کو مرکز سے محیط کی طرف' اندر سے باھر کی طرف لاتے ھیں -

آپ کمرے میں بیٹھے لکھ رہے ہیں کہ زور کی بارش آئی - ماحول کے اس تغیر سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور آپ کی جلد سے ٹکرایا - جلد میں اعصاب حسی لمسی کے سرے موجود ہیں اُن میں معاً تہیج پیدا ہوا - جونہی یہ تہیج مرکز (دماغ) میں پہنچا' اعصاب حرکی میں حرکت ہوئی' اور آپ نے اُٹھ کر کھڑکی یا دروازہ بند کردیا —— اِس عمل کے سارے اجزاء نظام عصبی کے ماتحت انجام پائے -

آپ ایک تاریک کمرے میں لیٹے ہوے ہیں' دفعتاً کوئی شخص تیز روشنی لیے اندر داخل ہوا - معاً اعصاب حسی بصری میں تموج یا تہیج پیدا ہوا - مرکز تک منتقل ہوا - اور معاً پیشانی کے اعصاب حرکی میں حرکت ہوئی' اور آپ کی کھلی ہوئی آنکھوں کے پپوٹے' آپ کے قصد کے بغیر ہی بند ہو گئے - یا یوں کہیے کہ آنکھ جھپک گئی —— یہ سب نظام عصبی کی فعلیت کا ایک دوسرا نمونہ تھا -

آپ نے کھانا نوش فرمایا - غذا معدے میں پہنچی - معاً معدے کی جھلی میں جو اعصاب حسی ہیں' اُن میں تموج ہوا - مرکز (نخاع) تک پہنچا - معاً اعصاب حرکی نے معدے اور پھر جگر' لبلبہ' انتڑیوں وغیرہ سارے آلات ہضم میں وہ حرکتیں پیدا کردیں' جو ہضم کے لیے ضروری ہوتی ہیں' اور آپ کو ان کا علم و شعور بھی نہ ہونے پایا —— یہ کل کارروائی بھی نظام عصبی ہی کی ماتحتی میں انجام پائی -

مثالوں نے ظاہر کردیا کہ جسم کی ساری مشین پر حکومت نظام عصبی ہی کی جاری ہے - اور ادنیٰ سے ادنیٰ عمل میں

بھی اس سے بےنیازی ممکن نہیں - مثالوں نے یہ بھی ظاہر کردیا کہ افعال زندگی بھی ایک قسم کے نہیں، تین قسم کے ہوتے ہیں :—

(۱) کچھ تو ہمارے علم و ارادہ کے تابع، ہم چاہیں تو اُنھیں کریں، چاہیں تو نہ کریں - مثال نمبر ۱ میں اُٹھنا، اور اُٹھ کر کواڑ بند کرنا -

(۲) کچھ ہمارے علم و شعور کے اندر، لیکن ارادہ و اختیار سے باہر - مثال نمبر ۲ میں آنکھ کا خود بخود جھپک جانا -

(۳) اور کچھ ہمارے ارادہ و علم دونوں سے خارج - ان پر اختیار تو ہم کیا رکھتے، یہ تو ہمارے علم و شعور میں بھی نہیں آیا کرتے ہیں - مثال نمبر ۳ میں معدے و جگر وغیرہ کے اعمال ہضم -

ماہرین فن نے افعال زندگی کی اِسی تکڑی کو ترتیب دے کر، ہر ایک کے لیے ایک ایک اصطلاح بھی قائم کر دی ہے - چنانچہ

(۱) ایک تو افعال ارادی ہوے - کھانا، پینا، چلنا، بولنا، سوچنا، لکھنا، پڑھنا وغیرہ اس کے تحت میں آگئے -

(۲) دوسرے افعال اضطراری کہلائے - ہنسی آجانا، آنسو نکل آنا، چھینک آجانا، اچانک جسم کا جھٹک اُٹھنا، سردی سے کپکپی، وغیرہ اس قسم میں داخل ہوے -

(۳) تیسری قسم کا نام افعال قسری پڑا - دوران خون، حرکت قلب، اعمال ہضم وغیرہ اس قسم کی مثالیں ہوئیں -

یہاں تک تو بات سیدھی اور کھلی ہوئی ہے - عامی و عالم سب یہی جانتے اور اسی کو مانتے ہیں - اس سے سادہ ذہن انسانی قدرتاً اس نتیجے تک پہنچتا ہے، کہ افعال قسری جو لازمۂ حیات ٹھہرے، وہ تو انسان کے دخل و اختیار سے بالکل خارج اور بےنیاز ہیں - رہے افعال اضطراری، اُن پر بھی انسان کا تصرف کچھ برائے نام ہی سا ہے - ہاں صرف افعال ارادی ایسے ہیں جو انسان کے ارادے کے تابع و محکوم ہیں، اور ان میں انسان اپنی خواہش اور مرضی سے جو اصلاح و ترمیم کرنا چاہے، کرسکتا ہے -

یہ ضابطہ اپنی جگہ پر بالکل بجا و درست سہی، لیکن پھر یہ کیا ہے کہ اس قاعدے کو ہم آپ ہر روز ٹوٹتا ہوا بھی دیکھتے ہیں ؟ افعال ارادی کیا ہمیشہ ہی ارادے کے محتاج و پابند رہتے ہیں ؟ اور جنھیں افعال غیر ارادی قرار دیا جا چکا ہے، وہ کیا لازمی طور پر ارادے کی گرفت سے آزاد ہی رہتے ہیں ؟ تجربہ، مشاہدہ روز ہی ایسی مثالیں پیش کرتا رہتا ہے -

فلاں اور فلاں عمل ایسے ہیں، جنھیں زید بیچارہ بڑی مشقت و تعب کے بعد، ارادے و ہمت کا پورا زور لگا کر ہی کر پاتا ہے - مگر بکر انھیں اعمال کو بےتکلف اس طرح چٹکی بجاتے کر گزرتا ہے کہ ان کا ارادہ ہی کرنا نہیں پڑا - اسی طرح فلاں اور فلاں قسم کے عمل ہیں کہ بکر کے لیے ایک پہاڑ، اور زید کے لیے بالکل پانی ! ـــــ سانس یا تنفس کو سب ہی فعل اضطراری کہتے اور لکھتے ہیں، کہ ہر چند

سکنڈ کے بعد انسان اپنے کو اس پر مضطر پاتا ھے - لیکن کیا حبس دم والوں کو آپ نے نہیں دیکھا' جو منٹوں سے گزر کر گھنٹوں بے تکلف سانس روکے رھتے ھیں؟ بلکہ سننے میں تو ایسے ایسے باکمال جوگی اور فقیر آئے ھیں' جو کئی کئی دن تک سانس نہیں لیتے! اُٹھتی ھوئی کھانسی کو روک لینا کون چور اور نقب زن نہیں جانتا؟ —— ھضم غذا سے بڑھ کر فعل قسری کی مثال اور کیا ھوگی - اس پر بھی ایسے ایسے لوگ موجود ھیں' کہ جب چاھتے ھیں پورا کھایا پیا اگل دیتے ھیں —— تو غرض یہ کہ اختیار' کم اختیاری' اور بے اختیاری کی جو حدیں بہت سوچ سمجھ کے قائم کی گئی تھیں' وہ کہاں قائم رھنے پائیں -

کسی سائیکل سیکھنے والے کو دیکھیے کہ شروع شروع اپنا جسم سادھنے میں کیسی دشواری پیش آتی ھے - بار بار گرنے سے اپنے چوٹیں لگتی ھیں' مشین الگ ٹوٹتی ھے' دوسروں کو ھنسی کا موقع اوپر سے ھاتھ آتا ھے - اس غریب کو ھر دفعہ نیا ارادہ' نئی ھمت صرف کرنا ھوتی ھے - لیکن پھر دیکھیے کہ وھی نوآموز جب سیکھ گیا' تو اب بے فکر و مطمئن' دوسروں سے خوش گپی کرتا ھوا' ھاتھ بھی دستہ سے ھٹائے' میلوں اور کوسوں بے تکلف اُڑا چلا جا رھا ھے' اور قوت ارادی کی مداخلت کی ضرورت ایک بار بھی نہیں محسوس ھوتی ——

ملک کے ایک مشہور و معروف خوش بیان مقرر صاحب بیان فرماتے ھیں کہ جب لڑکپن میں پہلی بار بولنے کھڑے ھوے تو بہت کچھ زور لگایا' لیکن معمولی سیدھے سادے لفظ بھی

منہ تک نہ آ سکے تھے، چہرے پر پسینہ آگیا تھا چند سال بعد سے اب یہ حالت ہے، کہ گھنٹوں کی بڑی سی بڑی تقریر کے لیے بھی گویا کچھ سوچنا ہی نہیں پڑتا - ادھر پلیٹ فارم پر کھڑے ہوے کہ لفظوں کا دریا خود بخود امنڈنے لگا ———

یہ سب چھوڑیے، اپنا بچپن تو یاد ہی ہوگا - ایک دن وہ تھا کہ جب پہلے پہل چلنا سیکھا تھا کس درجہ اہتمام اور کوشش کرنا پڑتی تھی، اور پھر بھی دو قدم سیدھے اور بغیر کسی سہارے کے نہیں چل سکتے تھے - اور ایک دن آج کا ہے کہ بس پہلا قدم اُٹھائیے تو زرا توجہ و ارادہ صرف کرنا ہوتا ہے - اس کے بعد یا تو کسی ساتھی سے گفتگو شروع ہو جاتی ہے، یا کسی فکر اور خیال میں طبیعت ڈوب جاتی ہے - میلوں کا فاصلہ طے ہو جاتا ہے، سیکڑوں ہزاروں قدم اُٹھ جاتے ہیں اور ایک بار بھی ارادہ کیا معنی توجہ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی!

اِن مشاہدوں اور تجربوں نے تو تحقیق کا قدم زرا ڈگمگا دیا - اور اب قاعدہ یہ بنانا پڑا، کہ افعال انسانی کی قسمیں ہیں تو تین ہی - لیکن یہ صحیح نہیں کہ ہر قسم اپنی جگہ پر مستقل اور لازوال، ناقابل فسخ و ناقابل ترمیم ہے - تینوں کے درمیان کوئی ایسی حد فاصل حائل نہیں، جو ناقابل عبور ہو بلکہ ہر فعل کے لیے ممکن ہے کہ مشق و مزاولت کے بعد ایک طبقے سے نکل کر دوسرے طبقے میں

داخل ہوجائے [۱] - نفس بشری کی یہ صلاحیت، یہ لچک، یہ استعداد شاید فطرت کا سب سے بڑا انعام اور سب سے زیادہ قیمتی عطیہ ہے، اور اسی کا نام عادت ہے -

فعلیات (فزیالوجی) کے ماہرین نے اپنی کتابوں میں کہا ہے کہ جب تہیج کا ردعمل متعین و مشخص ہو، یعنی جب فلاں تہیج کا ردعمل ہمیشہ فلاں ہی متعین صورت میں ظاہر ہو تو وہ عمل غیرارادی کہا جائے گا - لیکن تہیج کا ردعمل اگر متعین و مشخص نہیں بلکہ کبھی کچھ ہوگا اور کبھی کچھ، تو وہ عمل ارادی کہلائے گا - لیکن عادت کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ فعلیات کی ٹھہرائی ہوئی یہ تفریق مٹ جاتی ہے، اور مشق و مزاولت سے یہ بالکل ممکن ہوجاتا ہے کہ افعال ارادی کے دائرے میں ردعمل کا یہ عدم تعین فنا ہو جاتا ہے، اور تہیج کا کوئی خاص ردعمل متعین و مشخص ہو جائے -

کتاب کا موضوع نفسیات ہے - اور نفسیات کا تعلق خصوصی نظام عصبی ہی کے ساتھ ہے - اس لیے قدرتاً عادت کے بیان میں نظام عصبی کی عادت کا ذکر اصلی اور تفصیلی ہوگا - ورنہ یہ ہے کہ نظام عصبی کے علاوہ بھی، جسم کا ریشہ ریشہ عادت کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے —— جسم میں جہاں ایک مرتبہ چوٹ آگئی، پھر مشکل ہے کہ ٹھنڈی اور مرطوب ہوا چلے اور

[۱]—بعض کے نزدیک، لیکن صرف بعض کے نزدیک، دو ایک عمل قسری اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں، مثلاً حرکت قلب جو تمام‌تر مدار زندگی ہے -

اس پرانی چوٹ کی کسک تازہ نہ ہوجائے - جو بیماری پہلے ایک بار ہو چکی ہے، وہ تھوڑی ہی بےاحتیاطی ہوجانے پر پھر بہ آسانی لوٹ آتی ہے - ہاتھ اگر شدید صدمے سے اُکھڑ چکا ہے، تو دوبارہ خفیف صدمے سے بھی اُس کے اُکھڑ جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے --- اِن مثالوں نے روشن کردیا کہ اکیلے افعال ارادی ہی نہیں، بلکہ جو بھی حالتیں جسم کے کسی حصے پر طاری ہوں، سب قانون تعود کی پابند ہیں -

اور عادتوں کی یہ مثالیں تو حیات انسانی سے متعلق تھیں - حیوانی زندگی پر خیال دوڑائیے، اور جو جانور آپ کے تجربے میں آچکے ہوں، یا آسانی سے آسکتے ہوں، کتا، گھوڑا، گائے، بیل، بلی، گدھا، اونٹ، بھینس، طوطا، مینا، کبوتر، وغیرہ - اِن سب کی کیسی کیسی عادتیں پڑی ہوئی ہوتی ہیں، اور کس آسانی سے اُن کی نئی نئی عادتیں ڈالی جا سکتی ہیں --- حیوانات سے بھی آگے گزر کر نباتات و جمادات بلکہ بےجان مادے تک نظر کر جائیے - عادت کے تسلط سے باہر کسی کو نہ پائیے گا - کپڑا اپنی پہلی شکن پر کیسی سہولت سے تہ ہو جاتا ہے! ہموار زمین پر پانی ڈالیے، دھار جو راستہ بھی اختیار کر لےگی، دوبارہ ڈالیے تو پانی اسی دھار پر بہے گا، اور بار بار ڈالیے تو پانی اسی راستے کو نالی کی طرح گہرا کرتا چلا جائے گا - درخت کی ایک ہری بھری ہلکی ٹہنی کو اپنی طرف جھکائیے - اِدھر ہاتھ سے اس کا سرا چھوٹا، اور وہ بدستور سیدھی ہوگئی - لیکن اس کی قوت مدافعت بھی ہر مرتبہ گھٹتی جا رہی ہے - یہاں تک کہ چند بار کی

کوشش کے بعد وہ ہماری حسب مرضی مستقل طور پر ختم ہو گئی اور اب سرا چھوڑ دینے سے بھی سیدھی نہیں ہو جاتی —— یہ سب تجربے عادت کے اثرات کی ہمہ گیری و آفاق گیری کے مشاہدات ہیں -

———

عادت کو تو اب آپ پہچان گئے، اُس کے اثرات کو بھی جان گئے - لیکن یہ سوال رہا جاتا ہے کہ عادت کی ماہیت کیا ہے ؟ "کیوں کر" کا جواب تو معلوم ہو چکا لیکن "کیوں" کی گرہ کھلنی ابھی باقی ہے -

بہ طور مقدمے کے پہلے مادے کے چند خواص کو ذہن میں رکھ لیجیے —— نفسیات کے لیے ممکن ہی نہیں، کہ طبیعیات کے فن سے بالکل ہی بےتعلق و بیگانہ رہ جائے -

پہلی بات یہ ہے کہ موجودات مادی کی ترکیب نہایت ہی باریک غیر مرئی ذروں یا سالموں سے ہوئی ہے - سالمے سالمے میں باہم ایک کشش اتصال ہوتی ہے، جس سے یہ ایک دوسرے سے ملے رہتے ہیں، اور انھیں کے بڑے چھوٹے مجموعوں پر اجسام مادی کا اطلاق ہوتا ہے - یہ قوت کشش مشترکہ تمام سالمات عالم میں ہے - لیکن ان کے درمیان درجات کا بڑا فرق رہتا ہے - بعض میں یہ قوت زیادہ ہوتی ہے، بعض میں کم، بعض میں اور بھی کم - اور اسی فرق درجہ اتصال کی بنا پر مادہ کی قسمیں بھی تین قرار پائی ہیں -

(ا) منجمد - ان میں قوت اتصالی حد درجہ پر ہوتی ہے - ان کے سالمات ترکیبی ایک دوسرے سے بالکل پیوستہ

رہتے ہیں - ان میں صلابت و جمودیت زاید رہتی ہے -

(۲) سیال - ان میں قوت اتصالی نسبتاً کم ہوتی ہے - ان کے سالمات ترکیبی نسبتاً ایک دوسرے سے فاصلے پر رہتے ہیں - ان میں جمود و صلابت کا وجود برائے نام ہوتا ہے -

(۳) گیسی - ان کے سالمات کے درمیان کشش اتصال اور بھی کم پائی جاتی ہے - اور ان کے سالمات ترکیبی گویا ایک منتشر حالت میں رہتے ہیں -

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہر سالمے کی ساخت بجائے خود ناقابل تغیر ہوتی ہے، لیکن ہر اجتماع سالمات میں موثر خارجی سے متاثر ہونے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہوتی ہے - اس لیے ہر مرئی و محسوس جسم کی ہیئت و ساخت میں، یعنی سالمات ترکیبی کی ترتیب میں، تغیر و تبدل ممکن ہے، اور ہر محسوس و مرئی جسم اس تغیر کو قبول کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتا ہے -

تیسرا قانون یہ ہے کہ جسم کی تغیر پزیری اور سالمات ترکیبی کے درجۂ کشش باہمی کے درمیان تناسب معکوس قائم رہتا ہے - یعنی جسم کے سالمات ترکیبی میں کشش اتصال جتنی زائد ہوگی، جسم میں تغیر پزیری کم ہوگی - اور جتنی اُن میں کشش کم ہوگی، جسم میں تغیر پزیری زائد ہوگی —— کیا آپ روزمرہ دیکھتے نہیں کہ ہوا اور پانی (سیال اور گیسی مادہ) کی ہیئت میں تبدیلی کردینی کتنی آسان ہوتی ہے، اور منجمد (ٹھوس) مادے میں کتنی دشوار!

پھر ٹھوس ٹھوس کے بھی مدارج جمود یکساں نہیں ہوتے - یہ نہیں کہ ہر جامد درجۂ انجماد بھی یکساں ہی رکھتا ہو - جامد پتھر بھی ہوتا ہے اور گھاس بھی، فولاد بھی ہوتا ہے اور موم بھی، شیشہ بھی ہوتا ہے اور ربڑ بھی، ہڈی بھی ہوتی ہے اور گوشت بھی، چمڑا بھی ہوتا ہے اور نان پاؤ بھی، لیکن اس کے باوجود بھی درجۂ صلابت میں باہم کتنا فرق ہے! بعض ان میں سے کس آسانی سے اثرات خارجی قبول کرلیتے ہیں، اور بعض میں خفیف تغیر پیدا کرنے کے لیے بھی کتنی سخت و کاوش کی ضرورت پڑتی ہے -

انھیں قوانین کی روشنی میں تجربے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں جو مادہ سب سے زیادہ استعداد و صلاحیت تدریجی تغیر کی رکھتا ہے وہ وہ ہے جو منجمد ہونے کے ساتھ لچکدار بھی ہے - موم کی، ہڈی کے گودے کی، حلوائے تر کی مثالیں سامنے رکھیے - یہ جسم نہ تو اتنے سخت ہوتے ہیں کہ معمولی موثرات خارجی کا کوئی اثر ہی نہ قبول کریں - اور نہ پانی اور ہوا کی طرح اپنی ہر مستقل اور ذاتی ہیئت ہی سے معری ہوتے ہیں - یہ لچکدار جسم عام موثرات سے برابر متاثر ہوتے رہتے ہیں - لیکن بجز نہایت قوی موثرات کے کسی سے اتنا متاثر نہیں ہوتے کہ دفعتاً اُسی کے مطابق ڈھل جائیں - گویا اُن کا وصف امتیازی ان کی تدریجی تغیر پزیری ہے - اور عادت کا اصلی جوہر یا مایۂ خمیر جو کچھ کہیے یہی وصف خاص ہے - جس جسم میں یہ خاصیت جس درجے پر ہوگی، اُسی نسبت سے اُس میں عادت پزیری بھی ہوگی -

اب نظام عصبی کی ساخت پر نظر کیجیے، تو معلوم ہو گا کہ وہ ٹھیک اسی نوعیت کے مادے سے بنا ہے جو عادت پذیری کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔ بکری کا مغز اکثر لوگوں کی نظر سے گزرا ہو گا۔ بس سمجھ لیجیے کہ اسی طرح کا پلپلا، ملین، لچکدار مادہ انسان کے دماغ اور نخاع کے اندر بھی بھرا ہوا ہے، اور جس مادے سے عصبی ریشوں کی ترکیب ہوئی ہے، وہ بھی اپنی ملائمت، گداز، اور لچک کے لحاظ سے بالکل اسی کے مشابہ ہوتا ہے۔

لیکن مغز انسانی تو اِس حفاظت اور مضبوطی کے ساتھ کاسۂ سر (کھوپڑی کی ہڈی) کے اندر بند ہے، کہ ہر موثر خارجی سے تو وہ متاثر ہی نہیں ہو سکتا۔ عام اور طبعی حالات میں اس کے اوپر کارگر صرف دو تہیج خارجی ہوسکتے ہیں۔ ایک خون، دوسرے تہیجات عصبی۔ خون کا اثر اول تو حالت طبعی میں عموماً یکساں رہتا ہے، کوئی رد و بدل اس میں نہیں ہوا کرتا۔ دوسرے دوران خون کے اثرات محض عضویاتی ہیں۔ نفسیات سے انھیں براہ راست تعلق ہی نہیں۔ ہمارے آپ کے کام کی چیز صرف تہیج عصبی کے اثرات ہیں اور یہی گھڑی گھڑی، لمحہ لمحہ بدلتے بھی رہتے ہیں۔

اب یہاں سمجھ لینے کی بات یہ ہے کہ خارج سے جتنے تہیجات اعصاب حسی کے ذریعے سے دماغ یا نخاع تک پہنچتے ہیں، سب اپنے اخراج، اپنی نکاس کے لیے مغز سے باہر کا راستہ ڈھونڈھتے ہیں، اور اسی کو رد عمل کہتے ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ راستہ اعصاب حرکی ہی کا ہوتا ہے۔ اب بعض

افعال ایسے ہوتے ہیں، جن کے رد عمل کے راستے بندھے ہوئے، مقرر و مشخص ہوتے ہیں - یعنی جب جب وہ تہیجات پیدا ہوں گے، ان کا رد عمل ہمیشہ انہیں بندھے ہوئے اور متعین اعمال کی صورت میں ظاہر ہوگا - جسم کے بعض حصے جب گدگدائے جائیں گے، تو اس تہیج پر یہ رد عمل لازمی طور سے ہوگا، کہ جو اعصاب حرکی ہنسی یا مسکراہٹ سے متعلق ہیں، وہ جنبش میں آئیں، اور چہرے کے عضلات کی اضطراراً وہ صورت بن جائے، جسے ہر شخص ہنسنا یا مسکرانا کہتا ہے - یہ تو ہوئی افعال اضطراری کی ایک مثال - دوسری قسم کے افعال وہ ہیں، جن کے رد عمل بندھے ہوئے اور معین و مشخص نہیں - بلکہ ایک ہی تہیج یا رد عمل کبھی کچھ ہوتا ہے، کبھی کچھ، اور یہ وقتی اسباب و ہنگامی موثرات کے ماتحت - لڑکے کو دیکھ، باپ کبھی پیار کی بات کرتا ہے، کبھی کسی قصور پر اُسے سزا دینے لگتا ہے اور کبھی کسی فکر میں غرق، چپ چاپ رہتا ہے، نہ خوش نہ ناخوش - تہیج ایک ہی ہے یعنی وہی لڑکے کی موجودگی - لیکن حالات کے ماتحت رد عمل بدلتے رہے - یہ ہوا فعل ارادی کا ایک نمونہ -

فعل اضطراری و فعل ارادی کی تقسیموں کا ذکر تو اِسی باب میں چند صفحے اُدھر آچکا ہے - یہاں مکرر لانے سے مزید توضیح ہوگئی -

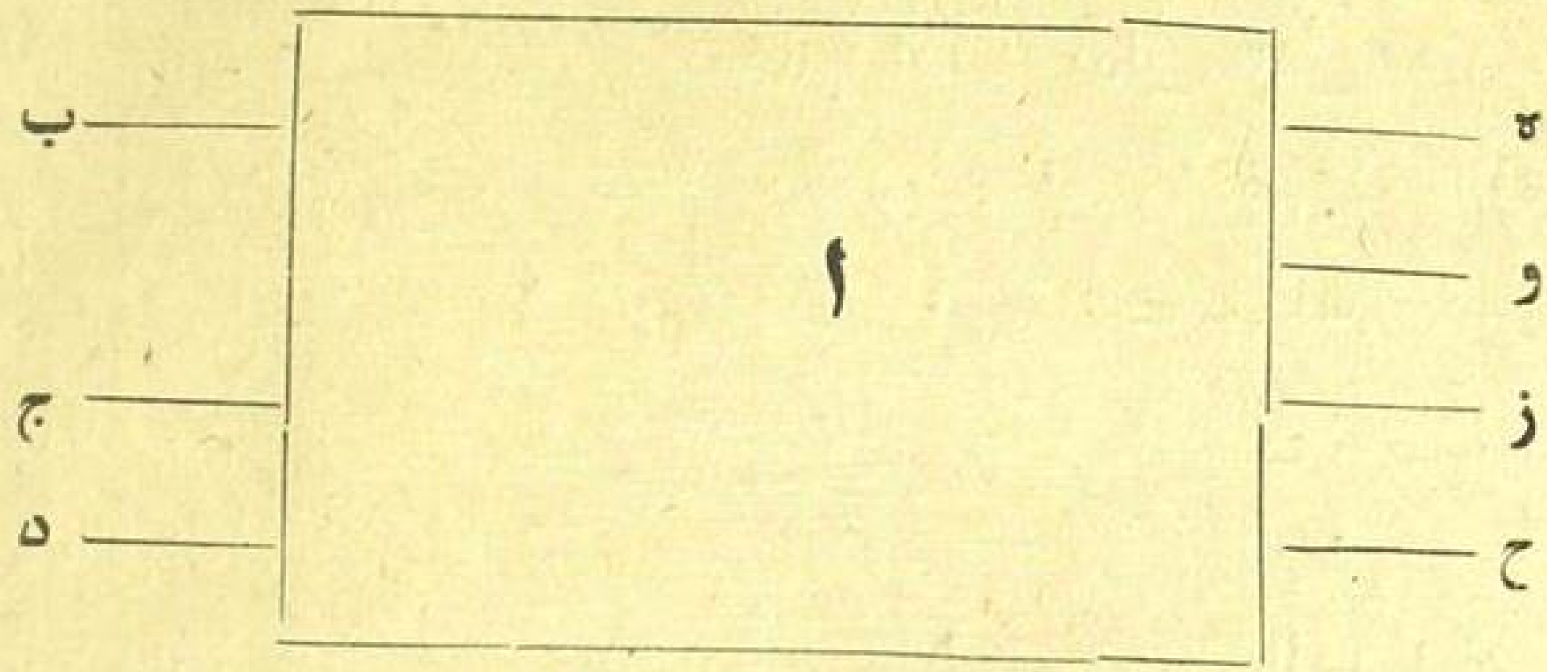
---

فعل اِضطراری و فعل ارادی کی تعریف کو ایک بار پھر ذہن میں حاضر کر لیجیے - فعل اضطراری وہ ہے، جس

کا رد عمل کسی مخصوص تہیج پر متعین و مخصوص نہ ہو۔ فعل ارادی وہ ہے: جس کے رد عمل ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ ہمیشہ اُس کی فہم و مرضی کے موافق ہی ہو گا۔ غصہ اکثر بیجا بھی آ جاتا ہے۔ ہنسی کبھی بےمحل بھی آ جاتی ہے۔ بات بہت دفعہ بےموقع بھی زبان سے نکل جاتی ہے۔

اب انسان کی خوش نصیبی یہ ہے کہ وہ اپنے افعال ارادی کو بھی بڑی حد تک افعال اضطراری بنا سکتا ہے، یعنی اپنی فہم و مرضی کے مطابق خاص خاص تہیجات کے لیے رد عمل بھی متعین و مخصوص کرسکتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ بعض افعال کو افعال اضطراری بنا لینا مقصود ہو تو ان کے تہیجات پر اپنے خاطرخواہ رد عمل کو ابتداء بہ کوشش مرتب کرے۔ اور ایک مدت تک برابر یہی کرتا رہے۔ کچھ عرصے کے بعد لچکدار و نقش پزیر مغز اور عصبی مادے میں رد عمل کے خطوط یا نقوش اتنے گہرے ہوجائیں گے کہ اُن میں ایک اضطراری کیفیت پیدا ہوجائے گی' اور اُن تہیجات کے وجود میں آنے پر وہ رد عمل از خود مرتب ہونے لگیں گے۔ اور اس طرح افعال اضطراری اور افعال عادی کے درمیان عملاً کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔

فعلیات کے اسی قانون کو ایک مادی نقشے کی شکل میں ملاحظہ کیجیے۔



اہموار و مسطح زمین کا ایک قطعہ ہے، اس میں ب، ج، د تین نالیوں سے پانی آتا ہے - ب کا پانی ہمیشہ ہ کے راستے سے باہر جاتا ہے - ج اور د کے پانی کی کوئی نکاس معین نہیں - کبھی و سے نکل جاتا ہے کبھی ز سے کبھی ح سے - لیکن اگر چند بار بہ کوشش و اہتمام ج کے پانی کو و سے اور د کے پانی کو ز کے راستے سے باہر نکالا جائے، تو اُس کے بعد ہوگا یہ کہ کسی مزید کوشش و اہتمام کی ضرورت ہی نہ باقی رہے گی - اور ج کے سرے کو و کے سوراخ سے اور د کے سرے کو ز کے سوراخ سے ملا دینے والی نالی ازخود بن جائے گی اور جس طرح ب اور ہ کے درمیان تلازم چلا آتا تھا، باقی دو جوڑے بھی اپنے درمیان تلازم پیدا کرلیں گے ---- مثال کے اس نقشے میں ا کو قائم مقام سمجھیے مرکزی نظام عصبی کا - داہنے ہاتھ کے خطوط گویا اعصاب حرکی ہیں، جو رد عمل کی حامل ہوتی ہیں - بائیں ہاتھ کے خطوط اعصاب حسی گویا اعصاب حسی میں، یہ تہیج آور ہوتے ہیں -

---

اوپر عادت پذیری کو "خوش نصیبی" کہا گیا ھے - خوش نصیبی کیوں؟ یوں کہ جس طرح جسمانی طاقت اور ذہانت' انسان کے پاس دو بہت بڑے آلے ھیں' کہ انھیں کے صحیح استعمال سے انسانی زندگی کامیاب بن سکتی ھے - اُسی طرح کسب عادت کی قابلیت بھی اس کے لیے بڑی نعمت ھے کہ اگر وہ اسے مفید طریقے پر استعمال کرے تو عظیم الشان کامیابیاں حاصل کرسکتا ھے - افعال عادی جب افعال اضطراری کے حکم میں داخل ھو جاتے ھیں' تو ان کے کرنے میں انسان کو وہ توجہ و ارادہ بھی صرف کرنا نہیں پڑتا' جو افعال ارادی میں' عادت کی آمیزش کے قبل تک لازمی ھیں - کیا آپ نے کبھی خیال نہیں کیا' کہ جو افعال ارادی افعال عادی بن جاتے ھیں' اُن میں انسان کو تکان و خستگی نسبتاً کتنی کم محسوس ھونے لگتی ھے؟ اور یہ نفع کوئی تھوڑا نفع ھے؟ کتنا وقت اس سے بچ جاتا ھے' کتنی قوت اس سے محفوظ ھو جاتی ھے - اور ھر بار تازہ کوشش اور جدوجہد کی کشمکش سے کیسی نجات مل جاتی ھے!

بے خیالی کی تو بات ھی دوسری ھے' ورنہ خیال کر کے دیکھا جائے تو ھماری زندگی کے افعال ارادی کا کتنا بڑا حصہ ھے' جسے ھم گویا توجہ صرف کئے بغیر محض عادت کی بنا پر رات دن کرتے رھتے ھیں ——— اگر شام کو سیر کے لیے باھر جانے کی عادت ھے' تو اِدھر وہ وقت آیا اور اُدھر طبیعت میں چلنے کا تقاضا از خود پیدا ھو گیا - اپنی جگہ

سے اُٹھنا، اُٹھ کر چلنا، شیروانی کی طرف بڑھنا، ہاتھ بڑھا کر اُسے کھونٹی سے اُتارنا، آستین میں ہاتھ ڈالنا، بٹن لگانا، موزے اٹھانا، ان کا پہننا، جوتے کو پیر میں ڈالنا، ڈوریاں کسنا، سر پر ٹوپی دینا، چھتری اٹھانا، ہاتھ میں لینا، دروازے کی طرف رخ کرنا، راستے میں قدم کا ہزاروں بار مشین کی طرح اٹھتے رہنا، غرض کوئی کہاں تک شمار کرائے - کتنی زائد مفرد حرکتوں کے مجموعے کا نام یہ شام کی سیر ہے - اور ان میں سے ہر حرکت ارادی ہی ہوتی ہے، بااینہمہ ان سے کسل و تکان نہیں پیدا ہوتا - یہی ساری حرکتیں اگر ایک بچے کو، یا بالکل نوآموز کو کرنی پڑجائیں اور اُسے ہر لحظہ اپنی توجہ اور قوت ارادی صرف کرتی رہنی پڑے، تو چند لمحوں میں وہ تھک کر چور ہوجائے، اور اس کی جان ہلکان ہو کر رہ جائے [۱] !

ایک پڑھا لکھا شخص ہزاروں لفظ بے تکلف پڑھ ڈالتا ہے، اور سیکڑوں لفظ بے تکان لکھ بھی ڈالتا ہے - لیکن زرا خیال میں تحلیل کر کے دیکھیے کہ یہ ایک پڑھنے

---

[۱]—بچہ کا نام مثال میں لے آنے سے یہ خیال نہ گزرے کہ یہ دقتیں بچپن یا ناتوانی کے باعث پیش آئیں گی - اصلی باعث صرف مشق و مہارت کا فقدان ہوگا - چنانچہ کوئی شخص اگر جوان ہی ہوگیا ہو، اور کسی غیرمعمولی اتفاق سے اس کو کبھی چلنا نہ پڑا ہو، تو پہلی بار چلنے میں اس کو بھی بچوں ہی کی دقتیں قدم قدم پر پڑیں گی -

کا سہل سا عمل عادی کتنی بڑی تعداد میں مفرد افعال ارادی کا مجموعہ ہے۔ کتاب کا کھولنا، صفحات کا اُلٹنا، سطروں پر نظر جمائے رکھنا، ہر صفحے کا ایک ایک لفظ اور ہر لفظ کا ایک ایک حرف پڑھنا، حرف کو حرف سے ملانا، لفظ کو لفظ سے ربط دینا، ساتھ ہی معنی کی طرف ذہن کو منتقل رکھنا، معنی کو معنی سے ربط دیتے رہنا، یہ اتنے سارے مرحلے تو ایک پڑھنے کے ہوے! لکھنے کا حال اس سے بڑھ کر۔ پہلے قلم اُٹھایا، ایک خاص انداز سے اس میں روشنائی لی، ایک خاص ہیئت کے ساتھ اُسے ہاتھ میں سنبھالے رہے، ایک خاص وضع کے ساتھ اُسے کاغذ پر چلایا، لفظ لفظ کے درمیان، اور حرف حرف کے درمیان ایک خاص تناسب کو قائم رکھا کہ وہ پڑھے جا سکیں، وغیرہ وغیرہ۔ پڑھائی پر کتنے اور مرحلوں کا اضافہ، سہل اور سیدھی سی لکھائی میں ہو گیا! ——— یاد کر لیجیے، جب بچپن میں ہجے لگا لگا کر پڑھنا سیکھا تھا، تو ایک ایک لفظ کے چلانے میں کتنی دقتوں کا سامنا ہوتا تھا، کیسی کیسی مشقت اُٹھانی پڑتی تھی۔ اور لکھنے میں تو بس کچھ پوچھیے نہیں، قیامت کا سامنا ہو جاتا تھا۔ یہ کرامت صرف عادت ہی کی تو ہے کہ اب لکھتے پڑھتے وقت حروف و الفاظ کی طرف توجہ صرف کرتے رہنے کی مطلق ضرورت نہیں رہتی، صحیح طور پر ازخود نکلتے رہتے ہیں۔ گویا کوئی کوشش و اہتمام ہی نہیں کرنا پڑتا۔ اور اس طرح مشقت اور تکان سے کتنی بچت ہو جاتی ہے!

پڑھنے اور لکھنے کو بھی چھوڑیے، بولنا تو ان سے بھی

کہیں آسان ہے۔عامی و عالم بولتے سب ہی ہیں۔اور بے تکلف بولتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کسی قسم کی خستگی اور نہ الفاظ کی سوچ سوچ کو تلاش۔ اب بچپن کو ایک بار پھر یاد کر لیجیے یہی الفاظ اپنی مادری زبان کے اُس وقت بھی تھے۔ سہل سے سہل دوحرفی لفظوں کے ادا کرنے میں کیسی کوشش و مشقت کرنا پڑتی تھی۔ کس طرح اٹک کر اور تتلا تتلا کر زبان سے نکالتے تھے۔ ایک ایک لفظ کے لیے کیسا زور لگانا پڑتا۔ اور اگر کوئی پورا فقرہ چھوٹا سا بھی بولنا پڑ گیا، پھر تو جیسے جان ہی پر کھیل گئے۔ کئی کئی منت صرف ہو جاتے، اور کئی کئی ناکام کوششوں کے بعد کہیں جاکر ادا کر پاتے تھے! ——— بچپن کا قصہ جانے دیجیے، آج زرا کوئی نئی زبان سیکھ دیکھیے، قدم قدم پر وہی دقتیں پیش آتی ہیں یا نہیں۔ بات بات پر مشقت، سیدھے سادے ادائے مطلب کے لیے لفظ و عبارت کی کیسی صبر آزما تلاش، غرض جب تک وہ غیر زبان مثل مادری زبان کے نہ ہوجائے، یا اس کے قریب قریب نہ پہنچ جائے، سفر کا ایک ایک قدم کیسا بھاری رہے گا!

جزئی مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں، اپنی مجموعی زندگی پر زرا جاسوس بن کر دیکھیے۔ روزمرہ کی بیشمار چیزیں، کھانا، پینا، سونا، جاگنا، اُٹھنا بیٹھنا، لیٹنا، چلنا، بولنا چالنا، سب کچھ قانون عادت ہی کے تابع تو نظر آئے گا! ہر شخص ایک خاص طریقے پر چلتا ہے۔ ایک خاص طریقے پر بولتا ہے۔ ایک خاص طریقے پر اُٹھتا بیٹھتا ہے۔

کھانے پینے، سونے جاگنے، پیشاب پاخانے تک کے خاص خاص اوقات ہوتے ہیں، اور خاص خاص معمولات - اور جب کبھی ان کے پورے ہونے میں کوئی اتفاقی رکاوٹ یا مجبوری پیش آ جاتی ہے، تو طبیعت کیسی بے چین ہو جاتی ہے! ——— اور آگے بڑھیے، انسان اپنے کپڑے اور جوتے پہننے اور اُتارنے تک میں عادت ہی کا غلام ہے - زید جب شیروانی پہنے گا، تو ہاتھ پہلے داہنی ہی آستین میں ڈالے گا - بکر جب جوتا پہنے گا، تو پہلے بائیں ہی پیر میں پہنے گا - یہ نہ ہوگا کہ کبھی اِس کا بایاں ہاتھ سبقت کرجائے - اور کبھی اُس کا داہنا پیر - بلکہ جب تک کوئی خاص مانع موجود نہ ہو، ابتدا ہمیشہ ایک متعین ہی ہاتھ پیر سے ہوگی ——— انسان ان چیزوں کو دھیان میں نہیں لاتا، ورنہ اگر جاسوس بن کر اپنی زندگی کی نگرانی شروع کر دے، تو نظر آ جائے کہ عادت کی پابندی، زندگی کے کتنے بےشمار جزئیات پر چھائی ہوئی ہے!

غرض یہ کہ روزانہ زندگی میں اکثر و بیشتر افعال عادت ہی کے بل پر بےتکلف اور بہ‌سہولت انجام پاتے رہتے ہیں - اور عادت پذیری کی صلاحیت اگر ہم میں نہ ہوتی، تو ہر ادنی سے ارادی فعل کے لیے بھی از سر نو قصد و کوشش اور مستقل توجہ و التفات کی ضرورت ہوتی، اور "تجربہ" و "کوشش" و "مشق" و "مہارت" کے قسم کے لفظ معنی سے خالی ہو جاتے - اور اُس کا عملی نتیجہ یہ ہوتا کہ جب کوئی ضروری سا ضروری اور آسان سا آسان کام شروع کرتے، تو شروع میں خستہ ہو کر چور چور ہو جاتے، اور خدا معلوم کیسے کیسے

ضروری کام ادھورے اور ناتمام ھی رہ جاتے - اور جن کاموں کے لیے ارادہ و توجہ کا پورا صرف ناگزیر ھے، مثلاً غور و فکر، علوم کی تحصیل، فنون کی تکمیل، اُن کے لیے نہ قوت ھی باقی رہ جاتی اور نہ وقت ھی ملتا! زندگی کیسی مصیبت کی زندگی بن جاتی، اور موجودہ زندگی سے کتنی پست رہ جاتی! ———

اسی لیے تو انسان پر لازم ھے، کہ جن افعال کو افعالِ خیر سمجھتا ھے، جن کاموں کو وہ اپنی خیر و فلاح کے لیے ضروری سمجھتا ھے، اُن کی عادت جلد سے جلد ڈال لے - نظامِ عصبی میں ایک طرف اُس کے بہترین دوست، اور دوسری طرف اُس کے بدترین دشمن، دونوں بن جانے کی پوری صلاحیت موجود ھے - چاھیے کہ اُسے بہترین دوست ھی بنا لیا جائے - یعنی بہترین عادتیں اور خصلتیں اپنے اندر جلد سے جلد راسخ کر لی جائیں -

آگ ایک ھی ھوتی ھے، لیکن کہیں تو وہ سردی میں ٹھٹھرنے سے ھمیں بچاتی ھے، کھانا پکا کر کھلاتی ھے، پانی گرم کر دیتی ھے - اِنجنوں کو، مشینوں کو چلاتی ھے - بڑے بڑے کارخانے اِسی کے دم سے چل رھے ھیں - لیکن وھی آگ، اگر زرا بھی کہیں بےاحتیاطی ھو جائے تو ھمارے گھر بار، کھیتی باڑی، مال و اسباب، بلکہ خود ھم کو جلا کر خاکستر کر دیتی ھے ——— کچھ ایسا ھی حال ھمارے نظامِ عصبی کا ھے - وہ اگر ایک طرف ھمارے لیے وقت میں اور قوت میں انتہائی کفایت پیدا کر دیتا ھے، مشقت و تعب سے بےانتہا بچا لیتا ھے، نیک عادتوں کو راسخ و پیوستہ کر کے ذھن کو ان کی طرف

سے فارغ و مطمئن کر دیتا ھے، تو دوسری طرف یہ بھی ھے کہ اگر کوئی بری عادت اُس میں جڑ پکڑ گئی ھے، تو وہ بھی نیک خصلتوں کی طرح اب ھمارے اختیار سے خارج ھے ـــــ بس سنبھلیے، قبل اس کے کہ وقت ھاتھ سے نکل جائے - کسی نامناسب لفظ کا سخن تکیہ بن جانا، دانت سے ناخن کاٹنا، ھونٹوں کا چباتے رھنا، کرسی جھکے ھوے پیر ھلاتے رھنا، داڑھی کھجلاتے رھنا، مونچھوں پر تاؤ دیتے رھنا، کان سے میل صاف کرتے رھنا، غرض جو بھی لت پڑ جاتی ھے، پھر کیا چھوڑے چھوٹتی ھے - اور عادتیں جب پوری طرح راسخ ھو جاتی ھیں، تو عقل و تمیز پر غالب آ جاتی ھیں - موقع و محل کا لحاظ اب اُٹھ جاتا ھے - انسان کی حالت ایک بیجان مشین کی سی ھو جاتی ھے کہ جہاں تھیج ملا، بس ردعمل اس کے مطابق بیساختہ سرزد ھونے لگتا ھے !

پرانے قیدی، بائیس بائیس، تیئس تیئس سال کے بعد جب قید سے رھائی پاتے ھیں، تو اکثر جیل سے اتنے مانوس اور ایسے اُس کے خوگر ھو جاتے ھیں کہ اس کے سامنے ان کی طبعی خواھش آزادی بھی ماند پڑ جاتی ھے، اور جیل سے خوشی خوشی باھر نکلنے کے بجائے اُلٹے اُسی میں پڑے رھنے کی تمنا اور درخواست کرتے ھیں ـــــ طوطا، مینا وغیرہ جو پرندے شروع ھی سے پکڑ کر پنجرے میں بند کر دیے جاتے ھیں، مدتوں بعد جب رھائی پاتے ھیں، قفس کے ارد گرد چکر لگا لگا پھر اسی کے اندر واپس آ جاتے ھیں ـــــ پلے ھوے

اور سواری میں نکلے ہوے گھوڑے، کبھی کبھی سائیس کی غفلت سے بھاگ بھی نکلتے ہیں - لیکن کچھ ہی دیر میدان میں کلیلیں کر، پھر چپ چاپ اصطبل میں آ کھڑے ہوتے ہیں ——— محکوم قومیں ایک عرصے کی عادت کے بعد محکومی ہی سے مانوس اور اُسی پر قانع و راضی ہو جاتی ہیں - اور کوئی خاص ولولہ "آزادی" کا اُن میں باقی نہیں رہ جاتا ———
پروفیسر جیمس اپنی مشہور و معروف سائکالوجی میں یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک سرکس کمپنی ریل پر سفر کر رہی تھی - ریل پٹری سے اُتر گئی - کمپنی کے ساتھ اُس کا شیر بھی تھا - شیر جس کٹھرے میں قید تھا، اس کا دروازہ کھل گیا، اور خونخوار درندہ باہر نکل آیا - لیکن بغیر کسی کو نقصان پہنچائے، اِدھر اُدھر چکر لگا، پھر اپنے کٹھرے میں واپس آکر بدستور بیٹھ گیا ——— عادت کے سامنے طبیعت کی مغلوبیت کی یہ سب کیسی نمایاں مثالیں ہیں !

اور یہاں پہنچ کر مشہور انگریز سپاہی، ولنگٹن کے اس قول کو، جو باب کے شروع میں نقل ہو چکا ہے، دہرا لیجیے، کہ "عادت، طبیعت ثانیہ کیسی ؟ اس کی قوت تو طبیعت کی قوت سے دس گنی ہے" ! ——— شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد اردو کے مشہور ادیب و انشاپرداز تو تھے ہی، حکمت و نفسیات کی بھی بعض باتیں بڑی گہری کہ گئے ہیں - چنانچہ اس سلسلے میں فرماتے ہیں (نقل بعینہ نہیں ہے، بعض مشکل الفاظ بدل کر آسان کردیے گئے ہیں)

"افعال ارادی میں، جسمانی ہوں یا دماغی، سب میں تھوڑا

بہت جہد کرنا ہوتا ہے، جس کو تم انگریزی میں اگزرشن کہتے ہو، عادت کا ضرور یہی نتیجہ ہے تخفیف مشقت جہد۔ یہاں تک کہ جب عادت راسخ ہوجاتی ہے تو فعل عادی فعل اضطراری کی طرح بلا قصد و ارادہ سرزد ہونے لگتا ہے۔

عادت حاکم ہے اور طبیعت محکوم۔ ایک شخص نے حکیم امام الدین خاں مرحوم کی حذاقت کی ایک حکایت نقل کی کہ کوئی مولوی صاحب بیمار پڑے۔ حکیم صاحب نے جلاب تجویز کیا، باوجودیکہ معدہ معیب تھا۔ اور مؤیدات بھی دیے گئے۔ مگر دست نہ آئے۔ حکیم صاحب کو خبر ہوئی۔ تیماردار سے فرمایا کہ جلد جاؤ اور مولوی صاحب سے کہو، بدستور کتابیں دیکھیں۔ راوی کہتا تھا کہ آدھ گھنٹہ بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ جلاب کا عمل ظاہر ہوا۔ لوگوں کو حیرت ہوئی تو حکیم صاحب نے فرمایا کہ طبیعت تھی کتاب بینی کی خوگر، اس کو خلاف عادت شغل مانوس سے ہوئی مفارقت، انقباض پیدا ہو گیا۔

عادت اُم الاخلاق ہے۔ باوجودیکہ عادت کو اخلاق پیدا کرنے، بنانے اور بگاڑنے میں دخل عظیم ہے۔ مگر افسوس ہے کہ عادت کی نگرانی میں پرلے درجے کی غفلت کی جاتی ہے۔ لوگوں کو عادت کا کہیں شعور ہوتا بھی ہے تو اکثر ایسے وقت میں جا کر کہ طبیعت مغلوب عادت ہو چکتی ہے۔ تم نے شاید خیال کیا ہو کہ یونانی اطبا کا کوئی نسخہ شربت یا مصری یا خمیرے سے خالی نہیں ہوتا۔ کچھ اس کی لم بھی

سمجھے - لم یہ ہے کہ شیرینی مرغوب ہے طبیعت کو - تو دوا میں کسی قسم کی شیرینی شامل کر دی جاتی ہے تاکہ طبیعت شرینی کو اصالتاً اور دوا کو تبعاً وصول کرلے - بعینہ یہی حال ہے انسان کی طبیعت اور اخلاق کا - طبیعت کو معدے کی جگہ سمجھو، اخلاق کو دوا اور عادت کو شیرینی - کوئی کام کیسا ہی ناموافق طبع ہو، عادت کی متھائی سے مل کر ضرور شیریں و لذیذ ہو جاتا ہے -

اب اگر عادت کے قاعدوں کو کوئی گننا چاہے تو ذیل کے عنوانوں کی تحت میں انھیں رکھ سکتا ہے :—

(۱) وقت کی کفایت - جو فعل و عمل، رک رک کر، ٹھہر ٹھہر کر، کہیں بڑی دیر میں انجام ہو پاتے تھے، اب چٹ پٹ ہونے لگتے ہیں - اِس سے بہت بڑی بچت وقت کی ہو جاتی ہے -

(۲) قوت کی کفایت - جن کاموں کے لیے قصد و کوشش، اہتمام و مشقت کے مرحلے طے کرنے پڑتے تھے، وہ اب بغیر کسی واسطے اور طوالت کے جھٹ جھٹ انصرام پانے لگتے ہیں -

(۳) کامیابی کا وثوق - پہلے جن کاموں کے انجام پانے میں تذبذب اور خوف غالب رہتا تھا، کہ دیکھا چاہیے یہ انجام ہو بھی پاتا ہے یا نہیں، اب ان میں یہ کھٹک مٹ جاتی ہے، اور بجائے تذبذب کے یقین ہو جاتا ہے کہ کامیابی ضرور ہو کے رہے گی - اور عموماً یہ خیال صحیح بھی نکلتا ہے —— نو آموز کا ہر نشانہ اچتتا رہتا ہے - منجھے ہوے سپاہی کا وار شاذ و نادر ہی خالی جاتا ہے -

خیر یہ نکتے تو اوروں نے بھی لکھے ھیں - ایک خاص پہلو کی طرف توجہ دلانا جیمس کا حصہ ھے - وہ کہتا ھے کہ سوسائٹی کے قیام و بقا کی بھی تو سب سے بڑی ضامن اور دنیا کے نظام معاشری کی بڑی محافظ یہی عادت ھی تو ھے - انسانی طبیعت میں رشک و حسد، مقابلے و سابقے کے جذبات جتنے تیز و قوی ھیں، سب پر روشن ھے - لیکن باوجود اِس کے پھر یہ گیا ھے کہ دنیا میں بہ حیثیت مجموعی امن ھی قایم رھتا ھے - وائسرائے ۲۵ ھزار پا رھے ھیں، دفتر کا کلرک ۲۵ روپیے پر گزر کر رھا ھے - وکیل صاحب ۸ ھزار کما رھے ھیں - اُن کا دربان آٹھ روپیے پر پڑا ھوا ھے - فلاں امیر ھیں، فلاں غریب ھے - یہ حاکم ھے وہ محکوم ھے - کوئی افسر ھے کوئی ماتحت ھے - ان ساری تفریقوں اور تقسیموں کے بعد تو چاھیے تھا کہ رشک وحسد، جنگ و جدل کی شدید عالمگیر آگ بھڑک اُٹھتی اور مستقل و مستمر افکار کسی ایک کو بھی چین سے نہ بیٹھنے دیتی ! لیکن اِس کے باوجود ھے عام طور پر یہی کہ لوگ اپنی پوری پوری زندگیاں امن و اطمینان ھی سے بسر کرلے جاتے ھیں - اس کا راز صرف یہ ھے کہ ھر شخص اسی عادت کے سہارے، اپنے ماحول کے اندر قانع ھے، اور اس کی بڑی سی بڑی جد وجہد، بڑی سی بڑی حوصلہمندی بھی بس ایک محدود ھی حلقے کے اندر گھوم پھر کر قائم رھتی ھے - جس گھوارے میں پلتے ھیں، بس اُسی میں کہنا چاھیے کہ عمر بھر پڑے رھتے ھیں -

وہ بڑے بڑے نامور جو اپنا نام ملکوں ملکوں پھیلادیں،

اور اپنے بعد بھی اُسے صدیوں چلادیں، ایسے فرد تو کہیں کروروں کی گنتی میں دو چار نکلتے ھیں، باقی عام قاعدہ یہی ھے کہ جیسی تعلیم، تربیت، صحبت، بچپن میں مل گئی، اور جو ماحول شروع زندگی میں میسر آ گیا، بس ساری عمر اُسی ڈھرے پر بغیر کسی غیر معمولی خلش اور بے چینی کے بسر ھوئے چلی جاتی ھے - اور حوصلہ مندیاں ساری کی ساری بھی، سمٹ سمٹا کر اُسی محدود حلقے کے اندر گھر کر رہ جاتی ھیں - اس ماحول کے اندر تو انسان خوب دوڑ دھوپ کر لیتا ھے، زبردست کروٹیں بھی بعض اوقات لے ڈالتا ھے - لیکن اس میدان سے باھر، جست کوئی شاذ و نادر ھی کرتا ھے - اس سے خارج ھر چیز کو سمجھی وھمت ھی کے دایرے سے خارج سمجھا جاتا ھے ——— عادت کا یہ عظیم الشان اثر، شخصی و فردی زندگی سے قطع نظر، اجتماعی و عالمی حدود کا اگر نہ ھوتا، تو آپ دیکھ لیتے، کہ کائنات بشری کا یہ موجودہ نظام کے دن قائم رہ جاتا ھے! اور دیکھ کیا لیتے، سچ یہ ھے کہ ھم اور آپ اس کے دیکھنے والے ھی کیوں موجود رھنے لگے تھے!

مصرع مشہور تو یوں ھے، کہ

عیب مے جملہ بگفتی ھنرش نیز بگوے

لیکن یہاں ھنر سب پہلے ھی شمار ھو چکے ھیں، تو اب موقع عیب شماری کے چھیڑنے کا ھے ——— اس گلشن ھستی کا کون سا پھول کانٹوں سے خالی ھے؟ ——— عادت اور افعال عادی سے ایک خطرہ تو یہی ھے کہ انسان کی عقلی و ذھنی

قوتیں کند ہو جاتی ہیں، اور ہوش کی بیداری غفلت و جمود سے بدل جاتی ہے - انسان لکیر کا فقیر بن جاتا ہے، اور بغیر اس کا لحاظ کئے ہوئے کہ اب حالات کیا ہیں، ماحول کیا ہے، ضرورت وقت کا تقاضا کیا ہے، اندھا دھند اُسی عادت کے عصا کے سہارے چلتے رہنا چاہتا ہے - پرانے دستور پر اصرار، پرانی ریت رسم پر جمود، اس قسم کی بیماریاں محض عادت پرستی کا نتیجہ ہیں -

اکثر تو ایسی صورت میں نو پیدا حالات کا، جدید ماحول کا سرے سے احساس ہی نہیں پیدا ہونے پاتا، شعور اسے قبول ہی نہیں کرتا کہ کسی اصلاح کی ضرورت ہے - اکثر بڑے بوڑھوں کے خیال ہی میں یہ بات نہیں آتی، کہ کسی تبدیلی کی ضرورت بھی ہے - اور کبھی ضرورت کا احساس تو ہو جاتا ہے، عقل قائل تو ہو جاتی ہے، لیکن اب ارادہ میں اتنے دم خم کہاں کہ جمی جمائی عادت کو اُکھاڑ پھینکا جائے، اور پامردی و کامیابی کے ساتھ نظام عصبی کی مزاحمت کا مقابلہ کیا جائے!
—— مرض کی دونوں صورتیں جو بیان ہوئیں، آپس میں ملتی جلتی ہوتی ہیں - نفسیاتی حیثیت سے بعینہ ایک نہیں - پہلی صورت کا تعلق ماندگی فہم و ادراک سے ہے - اور دوسری کا ضعف قوت ارادی سے -

"جدید" و "قدیم" کی کشمکش آج کی نہیں، ہمیشہ سے چلی آرہی ہے - معاشرت، سیاسیات، ہر دائرے میں چلی جاتی ہے - حق و باطل، خیر و شر کا معیار الگ ہے - نفسیات کو اس سے سروکار نہیں - نفسیات کے حدود میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے

کہ ''جدید'' و ''قدیم'' کے مفہوم صرف اضافی ہیں، صرف ایک دوسرے کی نسبت سے ہیں - فی الحقیقت نہ کوئی شے سرے سے نئی ہے، نہ کوئی چیز علی الاطلاق پرانی - جدت و قدامت صرف وجود تقابلی رکھتے ہیں - وہی خیالات جو نوعمری میں ذہن میں آ جاتے ہیں، جدید اور اس لیے لذیذ معلوم ہوتے ہیں - اور جن خیالات سے پہلے پہل سابقہ پختہ عمری کے بعد جا کر پڑتا ہے، وہ نامانوس اور بےمزہ معلوم ہوتے ہیں! ـــ آج کا ''روشن خیال'' جو کل ''تاریک خیال'' کہلائے گا، اور آج کا ''جمود پسند'' جو کل تک ''تجددنواز'' کہلاتا تھا، اس ادل بدل کا راز بھی چند سال کی اگل پچھل ہے اور بس - سنہ ۱۹۲۰ع کا ''انقلابی'' سنہ ۱۹۴۶ع میں ''اعتدال پسند'' ہے - اور جو سنہ ۱۹۴۶ع میں محتاط ہے، وہ سنہ ۱۹۲۰ع میں ''انتہا پسند'' رہ چکا ہے [۱] -

مرض بہر حال و بہر صورت لا علاج نہیں، بلکہ تقریباً لا علاج ہی نہیں - ذیل کی تدبیریں، بارہا تجربے میں آئی ہوئیں، عجیب نہیں کہ پوری طرح کارگر ہو جائیں :

(۱) پہلی چیز یہ ہے کہ ساتھ ساتھ عقلی و نظری قوتوں

---

[۱] ـــ یہ خیال نہ گزرے کہ یورپ کی ''آزاد خیال'' ''انقلاب دوست'' پارٹیوں میں بڑے بوڑھے بھی تو شامل رہتے ہیں - ''لبرل'' ہونا اور ہے لبرل پارٹی کا ممبر ہو کہلانا اور - خیالات کی ''آزادی'' اور ''انقلاب'' سب اسی منزل پر آ کر رک جاتی ہے، جو وہ اپنی نوعمری میں طے کر چکے تھے - بعد کو انھیں چیزوں کا اعادہ و تکرار رہ جاتا ہے -

کی بھی تربیت جاری رہے' اور انھیں ترقی دی جاتی رہے (تا کہ تکیہ تمامتر مشق و تکرار ھی پر نہ رہ جائے' اور قوت امتیاز کند نہ ھونے پائے) اور ترک و اختیار' قبول و رد کا فیصلہ ھمیشہ دلیل کے وزن اور شہادت کی قوت ھی کی بنا پر کرے - (تا کہ طبیعت ضد اور جمود کی خوگر نہ ھونے پائے) -

(۲) قوائے عقلی و فکری کی تربیت کے ساتھ ھر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اپنی عادتوں پر نظر ثانی بھی ھوتی رہے - اور جب کبھی کوئی عادت نامناسب' خلاف مصلحت یا غلط نظر آئے' معاً اُس میں ترمیم شروع کر دی جائے - اس کا انتظار ھرگز نہ کیا جائے کہ کوئی بہت بین و نمایاں نقصان محسوس ھو لے' جب اصلاح شروع کی جائے - اصلاح فوراً اور اسی لمحے سے شروع کر دی جائے ——— راہ کا معمولی پتھر ھر شخص ھٹا سکتا ھے - پتھر پر پتھر جمتے جمتے جب چٹان ھو جائے تو سیکڑوں آدمی مل کر بھی جنبش نہیں دے سکتے -

---

یہ معلوم ھو چکا کہ عادت ھے کیا شے' اور انسانی زندگی میں اس کی اھمیت کا کیا درجہ ھے - یہ بھی علم میں آ چکا کہ عادت سے نفع کیوں کر حاصل کئے جا سکتے ھیں' اور اس کے تاریک پہلو بھی کیا کیا ھیں - بہت سے ضمنی سوالات کے جوابات اور بھی مل مل گئے - اب ایک عملی سوال یہ ھے کہ کسب عادت کی شرطیں اور طریقے کیا کیا ھیں - یہ مانا کہ

بہت سے افعال ارادی کو افعال عادی بنا لینا چاہیے، لیکن آخر کیوں کر ؟

(ا) اہم ترین اصل یہ ہے کہ وقت بالکل ضائع نہ ہونے دیا جائے - عادت ڈالنے کی کوشش جلد سے جلد شروع کر دی جائے - وقت کا سوال بڑا اہم سوال ہے -

اوپر واضح یہ ہو چکا ہے کہ عادت کی بنیاد تمامتر نظام عصبی کی لچک پر ہے - لیکن نظام عصبی کی لچک جہاں ایک نعمت اور اس قدر قابل قدر ہے، وہاں یہ نعمت ذرا مستعجل بھی ہے، دیرپا اور مستقل نہیں - عمر کے ہر سال کے ساتھ اس طبعی صلاحیت میں انحطاط ہوتا جاتا ہے، تا آنکہ پیرانہ سالی میں یہ گویا بالکل جاتی رہتی ہے - طوطے اگر بوڑھے ہو کر پڑھنا سیکھ نہیں سکتے، تو آدمی بھی بوڑھے ہو کر کوئی نئی عادت مشکل ہی سے سیکھ سکتے ہیں -

بچپن میں یہ قوت منتہائے کمال پر ہوتی ہے - اسی لیے بچے نئی نئی عادتیں، نئی نئی زبانیں، نئے نئے علوم، نئی نئی جسمانی ورزشیں کس آسانی سے سیکھ لیتے ہیں ! کسی بچے نے بچپن ہی میں عربی اگر کسی عرب سے، اور انگریزی کسی انگریز سے سیکھ لی، تو چند ہی روز میں عربی یا انگریزی اپنی مادری ہی زبان کی طرح فر فر بولنے اور پڑھنے لگے گا - بڑی عمر پر پہنچ کر ہزار کوشش پر بھی وہ بات نہیں پیدا ہوتی - تو وجہ کیا، وجہ یہی، کہ اب سن آ جانے سے عضلات موٹے پڑ گئے ہیں، اور اعصاب کی لوچ سختی اور کرختگی سے بدل گئی ہے —— ماہرین فن کا بیان ہے کہ مرکزی نظام عصبی کی

لچک ۲۰ سال کی عمر تک، اور مرکزی نظام عصبی کی لچک ۳۰ سال کی عمر تک، پوری طرح قائم رہتی ھے - اور شاید یہی سبب تو ھے جو ہماری آپ کی ذاتی عادتیں، بولنے چالنے کا ایک خاص انداز، چلنے پھرنے کا ایک متعین طریقہ، لیٹنے بیٹھنے کی مخصوص وضع، ھنسنے مسکرانے کا کوئی خاص تہیج، یہ سب کوئی ۲۰ برس کے سن میں پختہ ہو چکتی ھیں - اور معاشری و اجتماعی عادتیں، سیاسی خیالات، مذھبی عقیدے، تمدنی رسم و رواج وغیرہ کوئی ۳۰ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے جم چکتے ھیں -

یہیں سے اُن لوگوں کی ناداني و نافہمی بھی ظاھر ہو جاتی ھے، جو کہا کرتے ھیں، کہ "ابھی سن پڑا ھے، آخری عمر میں توبہ کرلیں گے" - کوئی ات اگر چھوڑنے کے قابل ھے، تو اسی وقت، اِسی گھڑی ھے - ۱۰ - ۲۰ برس اور گزر جانے کے بعد اُس کا چھوڑنا آسان نہیں، نہایت درجہ دشوار ہو جائے گا - سگرٹ اگر آپ کو چھوڑنا ھے، تو اس کے لیے "ساعت مبارک" یہی ھے، جس وقت یہ سطریں آپ کی نظر سے گزر رھی ھیں - شراب و افیون، تاڑی، سیندھی، کوئی نشا اگر چھوڑنے والا ھے، تو اِسی منٹ، اِسی آن چھوڑیے - "کل" پر ھرگز نہ اُٹھا رکھیے ——— دن جوں جوں گزرتے جائیں گے، ھر پرانی عادت کا ترک اور نئی عادت کا اختیار، دشوار سے دشوار تر ھی ہوتا جائے گا - ھاں البتہ نا ممکن کبھی بھی نہ ہو گا - ھمت اگر قوی اور معمول سے زیادہ زبردست ھے، تو اصلاح کا امکان بالکل آخر وقت تک بھی ھے -

(۲) عزم بجائے خود مستحکم ہو، اور عزم محکم کے ساتھ گرد و پیش داخلی و خارجی مویدات کو بھی جمع کر لیا جائے۔

اصلاح کا کام اگر تذبذب اور ڈھیلے پن سے شروع ہوگا تو کمزور ہی رہے گا۔ اس لیے عادت بد کے ترک کے وقت اپنا ارادہ مضبوط اپنی ہمت پختہ ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی اس عہد کو موکد اور واثق بنانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے گرد و پیش بھی ہر قسم کے داخلی و خارجی تائیدی اسباب جمع کر لے، اور انھیں جمع رکھے۔

فرض کیجیے کہ کوئی مسلمان ہے، اور اب وہ شراب نوشی ترک کرنا چاہتا ہے، تو اُسے چاہیے کہ

(۱) مسجد میں جائے، وضو کرے، خدا کے سامنے عہد کرے، اور دعا بھی توفیق پابندی عہد کی کرے —— اپنے ذاتی عزم پر یہ ایک مذہبی تائید اس نے قائم کر لی۔

(۲) اپنے دوستوں، رفیقوں کے سامنے بھی اس عہد کو دہرائے بلکہ بہتر ہوگا کہ کسی بزرگ کے سامنے بھی —— عہدشکنی سے ایک زبردست مانع یہ رسوائی خلق کا خوف بھی رہے گا۔

(۳) ایسے لوگوں سے ملنا جلنا، ایسی مجلسوں میں اُٹھنا بیٹھنا، ایسے جلسوں میں آنا جانا، جہاں پھر سے مےنوشی کی تحریک ہو سکے، قطعاً ترک کر دے۔

(۴) ایسے لوگوں کی صحبت بالقصد اختیار کرنا جو پورے محتاط، پاکباز ہوں۔ اور اُن کی صحبتوں سے اُس

پرانے مرض کے عود کرنے کا احتمال ہی نہ ہو -

(۳) عمل کی عادت عمل کرنے ہی سے پڑتی ہے، محض اُسے عقلاً پسند کرنے، یا جذباتی طور پر اُس کی تمنا کرنے سے نہیں -

عادت ایک عملی چیز ہے، کرنے ہی سے پڑے گی - محض خیال کرتے رہنے یا چاہتے رہنے سے نہیں - محض خواہش یا تمنا جو ادنیٰ سعی عمل کے بغیر ہو، یہی نہیں کہ غیرمفید رہتی ہو، بلکہ بعض اوقات مضر بھی پڑ جاتی ہے - ایک بات کو صرف اچھا کہتے رہنے یا اچھا سمجھتے رہنے سے، اور اس کی جانب اقدام عمل بالکل نہ کرنے سے قوت عمل رفتہ رفتہ ضعیف و مضمحل ہو جاتی ہے - اور مسرت و انبساط کی چیز عمل نہیں بلکہ محض اس کا تصور یا خیال رہ جاتا ہے - یہاں تک کہ جب موقع آ جاتا ہے، تو ایسا شخص امتحان میں بری طرح ناکام ہوتا ہے اور عملی میدان میں بالکل بودا نکلتا ہے ـــــــ سائکالوجسٹ جیمس لکھتا ہے کہ روس کی ایک امیرزادی ایک رات کو تھیٹر دیکھنے گئیں - تماشے میں کوئی دردانگیز منظر پیش آیا - رحم‌دل خاتون برداشت نہ کرسکیں - بےاختیار رو پڑیں - "نقل" پر تو یہ رحم کا دریا امنڈ آیا - مگر "اصل" میں یہ ہوا کہ اُدھر گاڑی کا کوچوان غریب، میدان میں برفانی سردی کھاتے کھاتے اکڑ گیا - وہ مر گیا، اور اس سنگدل خاتون کا دل اس پر ذرا نہ پسیجا -

یہی حال اُن سب لوگوں کا ہوتا ہے جو ناول کثرت سے

پڑھتے، تھیٹر سینیما کثرت سے دیکھتے رہتے ہیں - اُن کے دلوں میں صفحۂ کاغذ یا تماشے کے فرضی غریبوں، مظلوموں، بیکسوں کے ساتھ رحم و ہمدردی کے جذبات بار بار پیدا ہوتے رہتے ہیں - لیکن چونکہ اپنی عملی زندگی میں انہیں یہ برتتے نہیں، واقعات کی دنیا میں ایسے لوگ بالکل بےعمل ہو کر رہ جاتے ہیں —— اپنے گھر میں کھانے کو نہیں، یہ خود اپنے ہاتھ پیر نہ ہلائیں گے - اپنے افسانوی ہیرو کی ہمت و خوش تدبیری کی داد دیتے رہیں گے ! ان کے اعزہ اقربا پڑوسی امداد کے لیے ان کی طرف بےکسی سے دیکھ رہے ہوں گے، اور یہ ادھر سے غافل وغیرملتفت اپنے فلمی ہیرو کی فیاضی و ایثار پر واہ کہنے میں لگے رہیں گے !

مرض کا علاج یہ ہے کہ اپنے اندر جب کبھی کسی تحریک سے بھی کوئی نیک جذبہ پیدا ہو، تو عملی زندگی میں روزانہ اُسے کچھ نہ کچھ برت ضرور لیا جائے - اور اگر زیادہ موقعے نہیں ملتے، یا زیادہ کی ہمت نہیں ہوتی، تو یہی سہی کہ کسی طالب علم کو کچھ بتادیا، سکھا دیا - اپنے کسی ملازم سے، یا اور کسی زیردست یا ماتحت سے قصداً ہنستے ہوے چہرے کے ساتھ، نرم بولی میں کچھ دیر بات چیت کرلی - اس طرح مشقوں سے قوت عمل بالکل زنگ آلود نہ ہونے پائے گی -

(۴) روزانہ اپنی زندگی میں کوئی عمل، اپنی عادت و مزاج کے خلاف اور اپنی طبیعت کے لیے ناگوار ضرور کر لیا جائے -

اهل تصوف کی اصطلاح میں اِس کا نام ''مجاهده'' هے - قوت ارادی میں حرکت اسی سے قائم رهتی هے ——— مهینے میں ایک آدھ دن فاقہ کر ڈالا - سونے کے وقت میں کبھی کبھی قصداً دیر کر دی - دعوت میں ایک سے ایک لذیذ کھانے سامنے آئے - دو ایک سے هاتھ قصداً روک لیا - بازار میں ایک شے پر رغبت اور ضرورت کی نظر پڑی، جیب میں قیمت بھی هے، پھر بھی طبیعت کو ضبط کر کے هاتھ روک لیا - اس طرح کے روزانہ زندگی میں لطیف و خفیف مجاهدے حقیر و بےحقیقت نہیں - امتحان کے وقت صاف نظر آجائے گا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں ضبط نفس کے خوگر هو جانے سے سیرت میں کتنی قوت اور مزاج میں کتنا تباین پیدا هو جاتا هے! یہیں سے اُن مذهبوں کی حکمت و دانائی بھی واضح هو جاتی هے - جنھوں نے اپنے پیرووں کے لیے آسان مشقیں اور سہل مجاهدے روز کی زندگی کے جزو بنا دیے هیں -

(٥) جب تک نئی عادت زندگی میں خوب رچ نہ جائے، پرانی عادت کے ترک میں کسی استثناء کو دخل دینا، ترک عادت کے حق میں زهر قاتل هے -

کی کرائی محنت برباد هو جائے گی، اور ساری کوششوں پر پانی پھر جائے گا، اگر دوران علاج میں بدپرهیزی کر لی گئی - اگر کسی نے شراب چھوڑنے کی نیت کر لی، اور چند هفتے اپنے عہد کو نباها بھی - لیکن اس کے بعد ایک بار گلاس منہ سے لگا لیا، تو یقین رکھنا چاهیے کہ وہ پچھلی

محنت اکارت ہی رہی - اور اب دوبارہ عادت کو اس حد تک راسخ کرنے کے لیے اُس سے کئی گنی مدت درکار ہو گی - جو عادی مجرم اپنے دل کو یوں سمجھانا چاہتا ہے کہ "خیر، آج اور کر لوں، اب کل سے تو ہمیشہ کے لیے چھوڑنا ہی ہے" - وہ اپنے کو ایک سخت فریب نفس میں مبتلا کر رہا ہے - عزم کی ہر تازہ شکست، جرم کی عادت کو زیادہ راسخ اور اس کے نقش کو زیادہ گہرا کرتی جائے گی —— نظام عصبی کے خلیے (وہ گول ذرے جن سے مادۂ عصبی کی ترکیب ہوئی ہے) بے درد، بے مروت حاکم ہیں - ان کی عدالت میں رو رعایت کا گزر نہیں، وہ اپنے قانون کی پابندی بہر حال کریں گے -

چھٹا باب

جذبات

سمندر کے کنارے ایک بڑے جہاز کی آمد آمد ہے۔ پلیٹ فارم پر ابھی سے ہجوم ہے۔ لوگ اپنے اپنے عزیزوں، دوستوں کی پیشوائی کو آئے ہوئے ہیں۔ اور جہاز ہے کہ کسی طرح آ نہیں چکتا۔ اتنے میں اس شدید انتظار کے عالم میں ایک افسر میگافون سے پکار کر کہتا ہے، کہ "سخت افسوس ہے کہ جہاز کی خیریت نہیں۔ ایک چٹان سے ٹکر ہو گئی ہے۔ مسافروں کے بچانے کی پوری اور سرگرم کوشش ہو رہی ہے۔ لیکن اندیشہ ہے کہ بہت کم بچ سکیں گے۔ ابھی تک ساری کوششیں سمندر کے غیر معمولی تلاطم نے ناکام رکھی ہیں"۔ آواز کا ہوا میں گونجنا تھا، کہ مجمع کی ہیئت ہی بدل گئی۔ جو بےفکری سے ٹہل رہے تھے، اپنی اپنی جگہ ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ جو اطمینان سے بیٹھے اور لیٹے ہوئے تھے۔ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ لوگ دوڑے، کچھ چیخے چلائے۔

سب کو جانے دیجیے۔ مجمع میں سے چار کو جائزے اور مطالعۂ نفسی کے لیے انتخاب کر لیجیے، کہ وہ نمائندگی سارے ہجوم کی کر سکتے ہیں —— ایک صاحب مجمع کی طرف پشت کئے کوچ پر بےخبر لیٹے ہوئے تھے، لیٹے رہے۔ کچھ خبر ہی نہ ہوئے۔ شدت سے گراں گوش بھی تو ہیں۔ دوسرے

صاحب ٹہلتے ٹہلتے زرا دیر کو رکے، اور کچھ غم و افسوس بھی ظاہر کیا، مگر اب پھر اُسی طرح ٹہلنے لگے - وضع قطع سے اس ملک کے نہیں، کسی دوسرے ملک کے باشندے معلوم ہوتے ہیں، - تیسرے صاحب خبر سنتے ہی رو پڑے، اور روئے چلے جارہے ہیں - چوتھے صاحب نے سنتے ہی ایک چیخ ماری - غش کھا کر زمین پر گرے، لوگ ہوش میں لائے - اب تک بدحواس اور غم و الم کی زندہ تصویر ہیں -

اِدھر یہ ہو رہا تھا، اُدھر آوازیں آئیں، کہ ""آگ لگی، بڑے گودام میں آگ لگ گئی"" - مجمع اب پھر منتشر ہوا، اور نئی ہیئت اختیار کرنے لگا - پہلے صاحب سماعت سے بےبہرہ بدستور اُسی طرح مجمع کی طرف پیٹھ کیے پڑے ہیں - دوسرے صاحب بے تحاشا دوڑے اور آگ بجھانے کی تدبیروں میں پیش پیش ہیں - تیسرے صاحب دوسروں کو دوڑتے جھپٹتے دیکھ کر خود ہی قدم اُسی طرف اُٹھارہے ہیں - چوتھے صاحب بدستور آہ و زاری میں مبتلا ہیں - یہ آگ بجھانے کی آوازیں گویا ان کے کان میں پڑ ہی نہیں رہی ہیں —— خارجی تاثرات بیان ہوچکے، اب زرا اُن کے معنی کی تلاش چاروں صاحبوں کی اندرونی و نفسی کیفیات میں کیجیے -

پہلے صاحب کو شدید گراں‌گوشی کی بنا پر دونوں واقعات کی خبر ہی سرے سے نہ ہوئی، تو وہ متاثر کیا ہوتے - بہ ظاہر ٹس سے مس نہ ہوے - دوسرے صاحب غیرملکی تھے، اس ملک والوں سے اجنبی - نہ جہاز کے مسافروں سے ان کا کوئی تعلق - بندرگاہ پر اپنا مال چھڑانے آئے تھے - جہاز اور

مسافروں کی غرقابی سن کر کچھ تھوڑا بہت ملول ضرور ہوے آخر انسان ہی تھے - البتہ جو مال چھڑانے آئے تھے' وہ اسی بڑے گودام میں تھا - آگ کی خبر سن بےتحاشا اُدھر دوڑ پڑے - تیسرے صاحب کے ایک گہرے دوست اسی جہاز سے آرہے تھے' اور یہ انھیں لینے آئے تھے - انھیں صدمہ ہوا' اور جب آگ کی خبر سنی تو پہلے تو اپنے شدید تر صدمے کے سامنے کچھ بےخبر سے رہے' لیکن دوسروں کو لپکتے اور دوڑتے دیکھ گویا خواب سے چونکے اور خود بھی اُدھر بڑھے - چوتھے بزرگ جن پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا' اُن کے ایک ہی اولاد تھی - اور یہی جوان لڑکا' امتحان پاس کرکے کئی سال بعد اِسی جہاز سے وطن واپس آرہا تھا - اُن غریب کی ساری امیدیں اسی کی ذات سے وابستہ تھیں -

مثالوں کی مدد سے جذبات کے (کم از کم جذبۂ غم کے سہی) خصوصیات' بغیر کسی کتاب میں پڑھے اور بغیر کسی اُستاد کے بتائے' ہم آپ خود اخذ کرسکتے ہیں .—

(۱) جذبے کو وجود میں لانے کے لیے ایک وقوفی کیفیت کا وجود لازمی ہے —— جو بیچارا کچھ سن بھی نہ سکا' اُس میں کوئی جذبہ بھی کسی قسم کا نہ پیدا ہوسکا' بہ ظاہر بڑے سے بڑے معرک کے باوجود -

(۲) جذبے کی قوت و شدت اُس تعلق کے متناسب ہوتی ہے جو نفس اور مہیج کے درمیان ہوتا ہے -

نفس کا تعلق جس جذبہ‌انگیز تحریک (اسی کو اصطلاح میں مہیج کہا جاتا ہے' اور آپ اس اصطلاح سے واقف ہو چکے

ہیں) سے جس درجے کا ہوگا، اُسی درجے کا جذبہ بھی اُس پر طاری ہوگا - تعلق اگر قوی ہے، تو جذبہ بھی قوی، تعلق اگر ہلکا ہے تو جذبہ بھی ہلکا ——— چوتھے صاحب کا تعلق کس قدر قوی تھا، جذبۂ غم بھی کس درجے کا اُن پر طاری ہوا - اجنبی کا تعلق جہاز سے سب سے کم تھا، رنج بھی برائے نام ہی ہوا - تیسرے صاحب کا تعلق جس حد تک تھا، اُسی حد کا غم بھی اُنھیں ہوا -

(۳) جذبے کے وجود میں آنے کے لیے لازمی ہے کہ نفس اُس وقت قوی تر جذبے سے مغلوب نہ ہو -

بوڑھے غمزدہ باپ پر آگ لگنے کا اثر کچھ بھی نہ پڑا، اس لیے کہ اُس گھڑی بیٹے کی موت کا قوی تر صدمہ دماغ پر مسلط تھا ——— آفتاب کی روشنی کے سامنے گیس کے ہنڈے اور بجلی کے قمقمے بھی تو ماند رہتے ہیں - یہی مادی دنیا کا قانون نفسی دنیا میں قوی جذبات کے سامنے ضعیف جذبات کو مغلوب بلکہ گویا معدوم رکھتا ہے -

(۴) جذبے کی شدت اور وقوف کی حدت میں نسبت معکوس پائی جاتی ہے -

جو صاحب بیٹے کے غم میں پچھاڑیں کھا رہے تھے، اُن کے سامنے عقلی دلائل کوئی لاکھ پیش کرے، وہ تسکین نہیں محسوس کرسکتے ——— شدت غیظ و غضب میں کیا آپ نے کبھی دیکھا نہیں کہ انسان اپنی ہی چیزیں توڑنا، پھوڑنا، پھینکنا، پھاڑنا شروع کر دیتا ہے، یہاں تک کہ اپنی جان بھی

اپنے ہاتھوں لے لیتا ہے - ایک مشہور مثل کے مطابق "پرائے شگون کے لیے اپنی ناک کاٹ ڈالتا ہے" - عشق میں جنونیوں کی سی حرکتیں کر گذرتا ہے - یہ سب مثالیں نظیر ہیں اسی قانون نفسی کی - نفس میں جذباتی کیفیت جتنی شدید و قوی ہوتی ہے، اُسی نسبت سے عقلی اور فکری قوتیں ماند اور مضمحل رہتی ہیں - ہر جذبے کے ہیجان کے وقت انسان سے گویا بے اختیار ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں، جنھیں سکون کی حالت میں خود اُسی کی عقل اگر مضر نہیں تو کم از کم مہمل تو ضرور ہی قرار دیتی -

(۵) جذبات میں اندرونی نفسی کیفیات کے ساتھ خارجی اعضاء میں بھی تغیر لازمی ہے -

فلاں صاحب غم سے بہت زیادہ متاثر ہوے، فلاں اُن سے کم، اور فلاں اور بھی کم - یہ آخر اوپر کی فرضی مثال میں حکم ہم نے آپ نے کہاں سے لگا دیے؟ بلکہ یہی کہاں سے معلوم ہوا کہ کسی کو رنج ہوا بھی؟ یہی نہ کہ فلاں صاحب روئے، چیخے - فلاں کے آنسو نکلے - فلاں نے رونی صورت بنائی - یہی بشرے اور جسم کے تغیرات ہی تو کل رہنما ہوے - اور جس کی ہیئت و وضع جسمی میں کوئی بھی تبدیلی دیکھنے میں نہ آئی، اُسے یہ کہکر الگ ہو گئے، کہ اس پر سرے سے کوئی جذبہ طاری ہی نہ ہوا -

(۶) جذبے کے ہیجان کے وقت انسان اپنے ہر تجربے کو اسی رنگ میں محسوس کرتا ہے -

غمزدہ پیرمرد کے پاس آکر، کوئی صاحب اگر گانے بجانے لگیں، تو اُس سے اُس وقت اُن کے غم کو کچھ بھی تسکین ہوگی؟ برعکس اس کے وہ سریلی آوازیں زہر معلوم ہوں گی، اور غم میں تلخی اور بڑھ ہی جائے گی ——— جذبے کی یہ خاصیت یہیں سے اخذ ہوئی کہ جب تک جذبہ ہیجان میں ہے، انسان ہر چیز کو جذبے کی آنکھ سے دیکھتا، اور جذبے کے کان سے سنتا ہے - عام اس سے کہ اُس چیز کو اس جذبے سے تعلق ہو یا نہ ہو -

غصہور انسان حالت طیش میں ایک ایک کو کاٹنے کو دوڑتا ہے، اپنے ہی بال نوچنے اور اپنے منہ پر طمانچے لگانے لگتا ہے - خوشی کی حالت میں ہر شے روشن اور نشاط انگیز نظر آنے لگتی ہے - افسردگی کے عالم میں آسمان و زمین سب اُداس اور دھندلے سے دکھائی پڑنے لگتے ہیں - فارسی کا مشہور مصرع

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

اِسی کیفیت نفسی کا ترجمان ہے -

نفسیات کے حقائق محض کتابی مسائل نہیں - آپ بیتی کے تجربے ہیں - مزید تائید و تصدیق ہر شخص خود کرسکتا ہے -

———

جذبے کے خصوصیات تو خیر معلوم ہوگئے - اب دیکھنا یہ ہے کہ جذبے کی ترکیب کن عنصروں سے ہوتی ہے ؟

جذبات پیدا کیونکر ہوتے ہیں؟ باطن کا ذرا بھی غور سے مشاہدہ کیجیے، تو جذبے کے ترکیبی اجزاء حسب ذیل نظر آئیں گے :—

(۱) ایک وقوفی کیفیت، یا مہیج کا ادراک ———— کوئی حسرتناک حادثہ، کوئی ہیبتناک واقعہ، کوئی مضحکہ خیز قصہ، رلانے ترانے، ہنسانے والا، علم و ادراک میں تو پہلے آئے -

(۲) ایک خالص احساسی کیفیت ———— اسی ادراک و علم پر حظ و کرب، انبساط و انقباض - لذت و الم وغیرہ کی احساسی کیفیت کسی درجے میں اور کسی قوت کے ساتھ مرتب ہوتی ہے -

(۳) متعین و معروف آثار جسمانی ——— غم میں آنسو بہنے، غصے میں تیوریاں چڑھنے، خوشی میں ہنسنے، مسکرانے سے کون ناواقف و ناآشنا ہے؟

یہ تو ہوے جذبے کے اجزاے ترکیبی - عالم و عامی سب کا جذبے کی اس ترکیب پر اتفاق ہے لیکن گفتگو اِن اجزاء کی باہمی ترتیب میں ہوئی ہے - جزو اول کا اول و اقدم ہونا مسلم ہے - سوال جزو دوم و سوم کی ترتیب کے باب میں چھڑا ہے - عام خیال یہ ہے اور اسی کو بڑے بڑے ماہرین فن بھی اب تک مانتے چلے آئے تھے، کہ نفس پر جہاں تحریک خارجی کا اثر پڑا، معاً اور فی الفور ایک ناگواری یا خوشگواری کی وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے - اور یہی جذبے کا جوہر

حقیقی ہے - پھر اس وجدانی کیفیت کے نتیجے میں اور بہ طور اُس کے آثار یا مظاہر کے کچھ جسمانی تغیرات بھی ہم میں پیدا ہو جاتے ہیں ——— کوئی ہم سے سخت گلامی کرتا ہے، اس سے معاً اور فی الفور ہمارے اندر ایک جوش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اُس کے بعد تیوریاں چڑھتی ہیں، آواز بلند ہوجاتی ہے، ہاتھ اُٹھنے لگتے ہیں - و قس علی ہذا - کوئی خوشی کی بات سنتے ہیں، معاً اور فی الفور اپنے اندر ایک انبساطی کیفیت پاتے ہیں، اور پھر چہرے پر مسکراہٹ یا ہنسی آنے لگتی ہے - کسی حادثے کی خبر ملتی ہے، اور معاً اندر سے رنج و غم کی کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے - اور پھر آنکھوں سے آنسو نکلنے لگتے ہیں، وغیرہ -

انیسویں صدی کی آخری چوتھائی چل رہی تھی، کہ امریکہ کے مشہور و معروف، بڑے پایہ کے ماہرین فن، پروفیسر جیمس [۱] نے کہا، اور ڈنمارک کے ایک ڈاکٹر لینگ نے اُن کی تائید کر دی، کہ ترکیب جذبہ کی یہ ترتیب صحیح نہیں، بلکہ جسمی تغیر کو نفسی تغیر پر تقدم زمانی حاصل ہے یعنی مہیج کی تاثیر سے معاً اور فی الفور تغیرات نظام جسمانی میں واقع ہوتے ہیں - پھر اُن کے نتیجے کے طور پر نفس بھی کوئی وجدانی کیفیت محسوس کرتا ہے! ——— گویا اب بات یہ ٹھہری، کہ چونکہ ہم مارنے دوڑے، اس لیے ہمیں غصہ آ گیا - چونکہ ہمارے آنسو نکلے، اس لیے ہمیں رنج محسوس ہوا -

[۱] سال وفات ۱۹۱۰ع - جذبات کے اس نظریے کا زمانہ ۱۸۸۴ع و ۱۸۸۵ء ہے -

چونکہ ہم ہنسے، اس لیے ہمیں خوشی محسوس ہوئی! نہ یہ کہ غصہ آیا اس لیے مارنے دوڑے، - یا رنج ہوا اس لیے آنسو نکلے، یا خوشی ہوئی، اس لیے ہنسی آئی!

اس نظریے، اور بہ ظاہر عجیب و غریب نظریے پر ابھی بحث چل ہی رہی تھی، کہ فرانس کے ایک ماہر فن، پروفیسر ریبو بولے، کہ اصلاً تو دعویٰ جیمس و لینگ ہی کا صحیح ہے، البتہ یہ صحیح نہیں کہ پہلے جسمانی تغیرات ہو لیتے ہیں، جب نفسی تغیرات ہوتے ہیں - بلکہ جسم و نفس کی یہ دو علیحدہ اور مستقل کیفیتیں ہی نہیں - یہ تو ایک ہی تصویر کے دو رخ، ایک ہی حقیقت کے دو مظہر ہیں - اور دونوں کے درمیان تقدیم و تاخیر زمانی کا کوئی سوال ہی نہیں!

سب سے پہلے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ آیا کسی جذبے کا وجود جسمانی تغیر کے بغیر اور اس سے علیحدہ ممکن بھی ہے؟ ایسا کبھی ہوا ہے یا کبھی ہوسکتا ہے کہ ہمیں غصہ تو آ جائے، لیکن نہ چہرہ سرخ ہو، نہ نتھنے پھولیں، نہ آنکھیں باہر کی طرف ابھریں، نہ منہ میں کف آئے، نہ پیشانی پر بل پڑنے پائے، غرض یہ کہ غصے کے "آثار" و "علامات" تو کچھ بھی نہ طاری ہوں، مگر غصہ آ جائے؟ کیا یہ کبھی ممکن ہے کہ دہشت کی کیفیت تو پیدا ہو جائے، لیکن چہرے کی زردی، سانس کی تیزی، دل کی دھڑکن، آواز کی گھگھی، جسم پر کپکپی، غرض دہشت کی معلوم و معروف علامتوں میں سے کوئی چیز وجود میں نہ آنے پائے؟ کیا اس کا کبھی کسی کو تجربہ

ہوا ہے کہ جذبۂ مسرت تو پیدا ہو گیا، لیکن نہ آنکھوں میں چمک آئی، نہ ہونٹھوں پر مسکراہٹ، اور نہ چہرے پر تازگی؟ ـــــ کتابی قیل و قال کو چھوڑیے۔ اپنے تجربے، اپنے مشاہدے، آپ بیتی سے سوالات کے جواب لیجیے۔

یہ بالکل ٹھیک ہے کہ غصہ، دہشت، مسرت کا تصور یا خیال بلا اُن کے آثار جسمانی کے بھی ذہن میں آ جاتا ہے، اور انسان جب چاہے اِن جذبات کو ان کے علامات سے بالکل الگ کرکے بھی فرض کرسکتا ہے۔ لیکن سوال یہاں جذبے کے تصور یا خیال یا مفروضے کا نہیں، بلکہ اصل جذبے سے متعلق ہے۔ سوال اس وجدانی کیفیت کی بابت ہے، جو خواہ لفظ و عبارت میں نہ ادا ہوسکے، لیکن اصل جذبے کا اطلاق تو اس پر ہوتا ہے۔ جذبہ اور جذبے کا تصور و خیال بالکل الگ چیزیں ہیں۔ جذبے کا تصور بےشک بلا کسی جسمانی تغیر کی آمیزش کے پیدا ہو سکتا ہے، لیکن خود جذبہ، ان "علامات و آثار سے بالکل خالی اور معرا ہو کر کیونکر ممکن ہے؟ ـــــ معلوم ہوا آثار جسمانی، جذبے سے خارج نہیں، جذبے میں داخل ہیں۔ وہ اس طرح ناگریز ہیں، جیسے جذبے کی اندرونی، نفسی، وجدانی کیفیت۔

اب ایک سادہ سا تجربہ اور کیجیے۔ جس جذبے کا امتحان مقصود ہو، اُن کے صرف آثار و علامات جسمانی اپنے میں بہ قصد و تکلف پیدا کرکے دیکھیے، کہ ساتھ ہی ساتھ بلا قصد و ارادہ خود وہ جذبہ بھی طاری ہوتا جاتا ہے یا

نہیں؟ بہ تکلف ہنسیے، مسکرائیے، خوشی کا چہرہ بنائیے اور پھر اپنے کو ٹٹولیے، کہ واقعی اپنے اندر کوئی انبساطی، نشاطی کیفیت پیدا ہوگئی یا نہیں ۔ قصداً روئیے، آنسو بہائیے، رونی صورت بنائیے، اور پھر اپنی طبیعت کا جائزہ لیجیے کہ واقعی حزن و غم کی کوئی کیفیت محسوس ہونے لگی یا نہیں؟ کم از کم جو لوگ تھیٹروں میں کام کرتے ہیں، پیشہ ور ایکٹر یا نقال ہیں، اُن کا تو یہی بیان ہے کہ ہم جب قزاق بنتے ہیں، اور زبان اور چشم و ابرو اور ہاتھ پیر سے قزاقی کی تصویر دکھانے لگتے ہیں، تو اپنے دل میں بھی اتنی دیر کے لیے شقاوت و تشدد کی کیفیت پانے لگتے ہیں، یا جتنی دیر جب ماتم کا پارٹ ادا کرتے ہوتے ہیں، دل میں بھی غم و حزن محسوس کرتے رہتے ہیں ——— جیمس نے برک (Burke) کے حوالے سے قدیم یورپ کے ایک ماہر قیافہ‌شناسی کا حال کہا ہے کہ اُسے اصول قیافہ شناسی سے واقفیت تو کچھ واجبی ہی سی تھی، البتہ اُسے کمال نقالی اور چربہ اتار لینے میں تھا، ۔ جب جس کی سی صورت چاہتا بنالیتا ۔ اس کے پاس جب کوئی اپنے قیافے کی شناخت کرانے آتا، تو یہ یہ کرتا، کہ جو علامتیں اور آثار اُس کے چہرے پر دیکھتا وہی اپنے پر طاری کر لیتا، اور اُسی کا سا چہرہ بشرہ اپنا بھی بنا لیتا ۔ پھر اُس کے بعد جو کچھ اپنے اندر محسوس کرتا، وہی اس کے سامنے اُس کی جانب منسوب کرکے دہرا دیتا ۔ اور اُس سے داد اپنی قیافہ شناسی کی لیتا ——— برک خود زبردست خطیب ہوا ہے ۔ بڑے بڑے مجمعوں کو ہلا دیتا ۔ جیمس ہی نے اس کا قول بھی نقل

کیا ھے کہ میں جب کسی غصہ‌ور، یا غم‌زدہ، یا بہادر کی صورت کا چربہ اُتارتا ہوں تو اکثر یہ ہوتا ھے کہ خود بھی غصہ یا غم و حزن یا شجاعت و جرأت محسوس کرنے لگتا ہوں۔

یہ ٹھیک ھے کہ یہ تجربہ ھمیشہ ھی پورا نہیں اترتا۔ بہت دفعہ اس کے خلاف بھی ھو جاتا ھے۔ اور جذبے کی ظاھری نقالی کے باوجود بھی وہ جذبہ پیدا نہیں ھوتا۔ تو اس کی وجہ یہ ھے کہ پوری نقل کے لیے ایسی رگوں اور پٹھوں، عضلے اور عصبے بھی کام میں لانے ضروری ھیں، جو انسان کے ارادے کے محکوم ھی نہیں۔ اس لیے ایسے موقعوں پر پوری جسمانی نقالی ھو ھی نہیں پاتی، اور یہاں جو کمی رہ جاتی ھے وہ تو محض اس لیے کہ خود نقالی ھی میں کسر رہ گئی ———

اور یہ تجربہ تو جب چاھیے، کر لیجیے، کہ جن کی وضع قطع بنائیے گا، اُن کی خو بو بھی کچھ نہ کچھ پیدا ھی ھو جائے گی ——— اور یہ جو مسلمانوں کی کتابوں میں درج ھے کہ جو شخص روزہ نہیں رکھ سکتا، وہ احترام ھی روزے کا ظاھر کرے۔ اس کی بنیاد اسی گہری نفسیاتی حقیقت پر ھے، کہ جو روزہ‌دار کی صورت اختیار کرے گا، اُس پر کچھ پرتو روزہ‌دار کی سیرت کا بھی پڑ جائے گا ——— اور خوددار، غیرتمند قومیں جو دوسروں کی وضع و لباس اختیار کرنا اپنے لیے باعث ننگ سمجھتی ھیں، اور بیگانوں کی ظاھری تشبیہ کو بھی ایک قوی جرم سمجھتی ھیں، اُس کی بنیاد بھی اسی حکیمانہ حقیقت شناسی پر ھے۔

اس کتاب کا مصنف خود ایک زمانے میں ھپناٹزم (عمل تنویم) کا دلدادہ رہ چکا ھے - مشق چڑھی ہوئی تھی - ایک سے زائد بار ایک لڑکے کو معمول بناکر اس سے کہنا شروع کیا، کہ "اب دیکھو تمھاری زبان خشک ہوگئی ھے، چہرہ زرد پڑ گیا ھے، دل دھڑکنے لگا ھے، جسم تھر تھر کانپنے لگا ھے" - غرض آثار و علامات سارے خوف و دھشت والے طاری کر دیے - لیکن نام اس کا نہ لیا - معمول جب بیدار ہوا، تو اُس نے پوچھنے پر کہا کہ "میں کسی چیز سے ڈر گیا تھا" - لیکن "کس چیز سے"؟ اس کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکا بجز اس کے کہ "آپ ھی آپ ڈر لگنے لگا تھا"؛ —— جب خوف کا جذبہ محض آثار و علامات قوت کے بل پر پیدا کیا جاسکتا ھے، تو آخر رنج، غصہ، خوشی وغیرہ دوسرے جذبات بھی کیوں نہ اسی طرح وجود میں آ جایا کریں؟

مسئلے کو اب ایک اور پہلو سے جانچیے - کسی بات پر ھمیں غصہ آیا، اور وہ بات ھے بھی واقعی غصے ھی کی - لیکن ہم نے پہلے سے خوب پکا عہد کر لیا تھا کہ ابکی جو غصہ آئے گا، تو ھم پورے ضبط سے کام لیں گے - چنانچہ اِس وقت ھم نے بہ کوشش و تکلف اپنے سارے عضلات پر قابو حاصل کر لیا - نہ تیور پر بل پڑنے دیے - نہ زبان سے کوئی تیز لفظ نکلنے پایا، نہ ھاتھ مارنے کے لیے اُٹھا، نہ اپنی جگہ سے ھم زرا بھی سرکے - نہ اُٹھنے کا قصد کیا، غرض کوئی ھلکی سی بھی علامت غصے کی اپنے اوپر طاری نہ ھونے دی - تو لیجیے، نتیجہ کیا نکلا؟ یہ

نکلا کہ سرے سے غصہ ہی ہوا ہو گیا ! آگاو جذبہ کو کیا متایا، کہ خود جذبہ ہی مت گیا ! ——— اب قدر ہوئی ان پرانے حکیمانہ مقولوں کی کہ جب غصہ آئے، تو کھڑے سے بیتھ جاؤ، اور بیتھے سے لیت جاؤ - خلاصہ یہ کہ جس جذبہ کو روکنا مقصود ہو، اس کے علامات و آثار پر پورا قابو حاصل کر لو، وہ جذبہ خود بہ خود فنا ہو جائے گا -

یہ تجربے تو ہمارے آپ کے ہوئے، اب زرا ڈاکتروں کی بھی سن لیجیے ——— ایک نوجوان لڑکی کو جگر و طحال کے انجماد خون کی بیماری ہوئی - جسم پر جو اثر پڑا، وہ تو خیر پڑا ہی، نفس پر (عام محاورے میں، دل و دماغ پر) یہ اثر پڑا کہ ہنسوڑ سے چڑچڑی بن گئی، خوش‌مزاجی کی جگہ افسردگی نے لے لی - پہلے جن چیزوں پر ہنستے ہنستے لوت جاتی، اُن پر اب مسکراہت نہ آتی - رفتہ رفتہ والدین کے ساتھ چاہ اور محبت بھی رخصت ہوگئی ———

ایک مجستریت صاحب تھے، بڑے صاحب فہم - جگر کے مرض میں مبتلا ہوے - اور رفتہ رفتہ حیات احساسی گھتنا اور فنا ہرنا شروع ہوئی - گرمی، غصہ، ہنسی، زندہ‌دلی سب نے ایک ایک کرکے ساتھ چھوڑ دیا - یہاں تک کہ دیکھتے دیکھتے وطن سے، گھر بار سے، بیوی بچوں سے، کسی سے کوئی دلچسپی، کوئی لگاؤ ہی نہیں رہ گیا - کبھی ذکر آجائے تو نام اس بےحسی سے لیتے کہ گویا ریاضی کے کسی مسئلے

کا بیان ہورہا ہے! ——— دونوں روایتوں کے راوی فرانس کے پروفیسر ایبو ہیں -

———

بحث کو اگر سمیٹئیے، تو حاصل بحث یہ نکلے گا، کہ کیفیات جذبی اور آثار جسمانی کے درمیان تلازم موجود ہے، نفیاً بھی اثباتاً بھی - یعنی جب جب بھی آثار جسمانی طاری ہوں گے تو کوئی کیفیت جذبی بھی ہمیشہ موجود ملے گی - اور جب آثار جسمانی کا فقدان ہو گا تو جذبے کا وجود بھی عدم میں منتقل ملے گا ——— منطقیوں نے اسی ربط تلازم کا نام قانون علت و معلول رکھا ہے - گویا آثار جسمانی کا علت اور کیفیت جذبی کا معلول ہونا تو نکل ہی آیا - اب بات اتنی سی رہ گئی، کہ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہوتی ہیں یا آگے پیچھے؟ ہمزمان ہیں یا مقدم و موخر؟

جیمس کا کہنا یہ ہے کہ پہلے اعضاے جسم متاثر ہولیتے ہیں، اس کے بعد نفس میں احساس کیفیت پیدا ہوتا ہے - اور آثار جسمی زمانے کے اعتبار سے احساس نفسی پر مقدم ہوتے ہیں - گویا ہم کسی کو اس لیے نہیں مارتے کہ غصے میں ہوتے ہیں، بلکہ چونکہ مارنے لگتے ہیں اس لیے غصے میں آجاتے ہیں! پروفیسر ریبو اس میں ترمیم یہ پیش کرتے ہیں، کہ یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ آثار جسمانی علت ہوتے ہیں کیفیات جذبی کے، اس لیے کہ بغیر اُن کے اِن کا وجود ممکن نہیں - لیکن یہ جزو صحیح نہیں کہ یہ جسمانی اور نفسی تغیرات آگے پیچھے ہوتے ہیں -

بلکہ جس طرح بڑے دماغ (مخ) کے ذرات کی مادی و جسمانی حرکت اور نفس کی شعوریہ دو مستقل جداگانہ چیزیں نہیں، اور دونوں میں کوئی ایک دوسرے سے آگے پیچھے نہیں؛ اُسی طرح یہاں بھی ایک ہی خارجی تحریک سے دو نتیجے ہمزمان اور ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ برآمد ہوتے ہیں، ایک جسمی، دوسرا نفسی ۔ اس لیے تقدیم و تاخیر کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا -

مسئلے کی تشریح ہوچکی، اب دو ایک اِعتراض بھی سنتے چلیے - ایک اعتراض یہ ہوا ہے کہ ایک ہی تحریک سے نفسی کیفیت تو سب انسانوں میں یکساں ہی ہوتی ہے، لیکن پھر آخر آثار جسمی میں اتنا فرق باہم کیسے پیدا ہو جاتا ہے ؟ حادثے کی خبر سن کر کسی کے تو صرف آنسو نکلتے ہیں - کوئی چیختا چلاتا بال نوچنے اور کپڑے پھاڑنے لگتا ہے، اور کوئی سناٹے میں آکر چپ ہو جاتا ہے - تو اگر جذبے کا اصلی جوہر یہ جسمی تغیرات ہی ہیں، تو ایک ہی علت کے معلول، ایک ہی سبب کے نتیجے ہونے کے باوجود ان میں اتنا اختلاف کیسے ہے؟ —— گویا یہ سوال صرف اسی نظریۂ جذبات پر وارد ہوتا ہے، اور جذبے کی تشریح اگر اُسی قدیم طرز پر کر دی جائے، تو اس پر وارد نہ ہو! سوال تو ایسا ہے کہ جذبے کی تکوین کی کوئی سی بھی توجیہ اختیار کی جائے، اُس پر بھی اسی طرح وارد ہوگا - کوئی سا بھی واقعہ فرض کر لیجیے اُس کے جذباتی اثرات تو ہر جگہ الگ الگ نوعیت تعلق کے ماتحت پڑیں گے - جرمنی کی شکست سے جرمن دوستوں کا کیا حال ہوا، اور برطانیہ

دوستوں یا امریکہ دوستوں یا روس دوستوں کا کیا؟ ظاہر ہے کہ ایک دوسرے کی ضد - تو ایک ہی تحریک سے دو مختلف نتیجے، انتہائی مسرت اور انتہائی غم کے تو چھوٹی بڑی ہر مثال میں پیش آتے ہی رہتے ہیں، اس کو اس خاص نظریۂ زیر بحث سے کیا تعلق؟

اصل یہ ہے کہ ہر جدید شعوریت نفس کے شعوری مزاج یا سابق شعوری کیفیتوں کے مجموعے کے تابع ہی ہوتی ہے - ہر فرد اپنی تعلیم، تربیت، ماحول، صلاحیت و استعداد کے مطابق ایک شعوری مزاج رکھنے لگتا ہے، اور کوئی نیا شعوری تجربہ جب اُسے ہوتا ہے، خواہ وقوفی قسم کا ہو یا احساسی نوعیت کا، وہ اسی مزاج کے ماتحت ہوتا ہے - غالب کی شاعرانہ زبان میں -

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

عدالت میں مقدمہ ایک ہی ہوتا ہے - لیکن حاکم اُسے کس نظر سے دیکھتا ہے، وکیل کس نظر سے، اور فریق کس نظر سے - پھر وکیل وکیل کی، فریق فریق کی نظر میں کتنا فرق! مقدمے کا فیصلہ ہوتا ہے تو اسی ایک فیصلے کو ایک فریق "جیت" کہتا ہے اور دوسرا "ہار" - ایک کے ہاں گھی کے چراغ جلتے ہیں، دوسرے کے ہاں رونا پیٹنا پڑ جاتا ہے - تو بات تو ایک ہی ہوتی ہے - تحریک خارجی ایک ہی رہتی ہے، لیکن جس کا جو مزاج شعوری ہوتا ہے، اسی کے ماتحت اس میں جذبات بھی تحریک خارجی سے پیدا ہوتے رہتے ہیں ——— مادیات کا قانون

بھی تو کچھ ایسا ہی ہے - بارش ایک ہوتی ہے لیکن ہر زمین اس کے اثر سے یکساں لالہ‌زار نہیں ہوجاتی - آفتاب ایک ہے لیکن اس کی شعاعوں سے کائنات کا ہر ذرہ یکساں مستفید نہیں ہوتا ---- باب کے شروع میں جو مثالیں آچکی ہیں اُن سے ایک بار پھر کام لیجیے - جہاز کی غرقابی کا واقعہ ایک تھا - اس سے تاثرات جذباتی ہر ایک پر کیسے مختلف ہوے -

ایک سوال یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ اگر آثار جسمی جذبے کی بناوٹ میں داخل ہیں، تو پھر یہ کیا ہے کہ مختلف جذبات کے آثار جسمی بالکل ایک ہوتے ہیں - آنسو فرط غم میں بھی نکلتے ہیں، اور انتہائی مسرت میں بھی - چہرے پر سرخی کا دوڑ جانا غصے کی علامت بھی ہے اور حیا کی دلیل بھی - دوڑنا بھاگنا غصے کے وقت بھی ہوتا ہے اور خوف کے وقت بھی - حالانکہ ظاہر ہے کہ اندرونی کیفیتیں ان موقعوں پر کیسی ایک دوسرے سے مختلف بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہوتی ہیں! -

جواب دشوار نہیں، آسان ہے - یہ بات ہی سرے سے ٹھیک نہیں، کہ مختلف جذبات کے آثار بالکل ایک ہوتے ہیں - مشابہ ہونا اور ہے اور متحد ہونا اور - مختلف جذبات کے آثار جسمانی باہم مشابہ تو ہوسکتے ہیں، لیکن متحد نہیں ہوتے - اور اختلاف بھی اتنا نمایاں رہتا ہے کہ کسی صاحب تجربہ اور صاحب نظر کو دھوکا نہیں ہوتا ---- غصے کی سرخی اور ہوتی ہے، حیا کی اور - غصے میں چہرہ تمتما جاتا ہے، حیا کی سرخی میں حجاب کی جھلک رہتی ہے - غصے کی سرخی آنکھ سے

شروع ہوتی ہے، حیا کی کان اور چہرے سے ——— دوڑ بے شک غصے اور خوف میں مشترک ہے لیکن غضبناک کی جھپٹ اور دہشت زدہ کی بھاگ دونوں میں کتنا نمایاں فرق ہوتا ہے۔ غصے میں مہیج کی طرف، یا اس پر لپکا جاتا ہے۔ دہشت میں اُلٹا اس سے بھاگا جاتا ہے ——— آنسو بہنے والے چہرے کو دیکھتے ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ رونا فرط غم سے ہے، یا شدت مسرت سے، یا تیز مرچ کھا جانے سے!

اور نفس تشابہ بھی اگر کسی کے نزدیک قابل گرفت ہے، تو مختلف جذبات کی اندرونی اور نفسی کیفیتیں بھی تو باہم مشابہ اور مماثل ہوتی ہیں۔ اس سے تو کسی حال میں مفر نہیں۔

———

ساتواں باب

احساس

حس اور جذبے کی ابتدائی کیفیتیں ملتی جلتی ہوتی ہیں، گو فوراً بعد نمایاں فرق محسوس ہونے لگتے ہیں - اہل فن نے اسی لیے دونوں کا ایک جامع عنوان احساس کا رکھا ہے -

ہم اُٹھ کر چلے - ٹھوکر لگی - چوٹ آئی - جسم نے اذیت محسوس کی - یہ مثال حس کی ہوئی - کسی نے سر بازار ہمارے کسی بزرگ کو گالی دی - سن کر ہمیں سخت غصہ آیا - طبیعت میں بڑی ناگواری پیدا ہوئی - جی میں آیا، مجرم کو پوری سزا دیں - یہ صورت جذبہ طاری ہونے کی ہوئی ——— پہلی کیفیت تمامتر اور براہ راست ایک محرک خارجی کا نتیجہ تھی - حضوری تھی - جسم متاثر ہوا، اور اس کا نقش شعور کے روبرو آگیا - دوسری کیفیت تمامتر دماغی ہیجان کا نتیجہ تھی - استحضاری تھی - جسم و مادے سے براہ راست اس کا تعلق نہ تھا - پھر یہ بھی ہے کہ چوٹ کی متعین نشان دہی کی جاسکتی ہے - غصے اور ناگواری کو جسم کے کسی حصے سے مخصوص و متعین نہیں کیا جاسکتا -

اب فرض کیجیے، کہ گالی سننے والا بجائے کسی سمجھدار بالغ کے کوئی ناسمجھ بچہ ہوتا، اس پر اس کا کوئی اثر ہی

نہ ہوتا - وہ اہانت کا مفہوم ہی ابھی نہیں سمجھتا ہے - وہ کوئی ناگواری محسوس نہ کرتا - حالانکہ وہی بچہ ٹھوکر کی چوٹ پوری طرح محسوس کرتا ——— اس سے ظاہر ہوا' کہ حس' شعور کی ایک ابتدائی' بسیط کیفیت کا نام ہے' بہ خلاف اس کے جذبہ' شعور کی ثانوی' مرکب کیفیت ہے -

اب اگر دونوں کی تعریف کرنا چاہیں' تو کہ سکتے ہیں' کہ حس' احساس کی اختلالی کیفیت کا نام ہے جو جسم کی سطح پر کسی موثر خارجی یا داخلی کے عمل سے پیش آجاتی ہے - اسی طرح جذبہ اس احساسی کیفیت کا نام ہے جو جسم کے اندر اور شعور کی مجموعی کیفیات کے حاصل سے پیدا ہوتی ہے -

احساسی کیفیتیں غم و مسرت' خوف و غصہ، محبت و نفرت وغیرہ کی تو ہم پر طاری ہوتی ہی رہتی ہیں - نوعی حیثیت سے کیفیت یا تو خوشگوار ہوگی یا ناگوار - اور بعض نے کہا ہے کہ ان دو کے علاوہ ایک تیسری شکل' یعنی خوشگوار و ناگوار کے علاوہ بھی ممکن ہے مثلاً ایسی حیرت' جو محض حیرت ہی ہو' نہ خوشگوار نہ ناگوار - گو اس پر جرح بھی ہوئی ہے کہ انبساط و انقباض سے بالکل قطع نظر کسی احساسی حالت میں ممکن نہیں' کسی نہ کسی درجے میں انبساط یا انقباض ضرور شامل ہوگا - بعض احساسات کو جبلتوں سے موسوم کرنا زیادہ موزوں ہوگا - مثلاً شیر خوار بچے کا رونا' یا اس کا دودھ پینا - احساسات کی تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ نفس کے ہیجانات کا نام ہیں-

احساس تمامتر ماحول کے تابع رہتا ھے' اور ماحول کا حال یہ ھے کہ ہر لمحہ بدلتا رہتا ھے' گو بہت ھی خفیف مقدار میں' جو شعور میں اکثر پوری طرح آ بھی نہیں پاتا ھے۔ احساسات اگر تیز و قوی ہوتے ھیں' تو معاً جسمی تغیرات بھی نمایاں طور پر ہوتے ھیں۔ یہ جسمی تغیرات بجائے خود نفس پر موثر ہوتے ھیں' اور ان سے پھر نئے نئے احساسات وجود میں آتے ھیں ——— تو غرض یہ کہ جذبے کے وجود میں آنے کے لیے دو چیزیں ضروری ھیں :—

(۱) پہلی چیز یہ کہ احساس میں ایک خاص حد تک قوت و شدت پیدا ہو' جس سے جسمی عضوی تغیرات وجود میں آسکیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ خود یہ تغیرات محسوس بھی ہوں۔

احساسات کے سلسلے میں یہ بات بڑے کام کی ھے' خصوصاً اُستادوں اور مربیوں کے یاد رکھنے کے قابل کہ بچوں اور بڑوں کے احساسات بالکل یکساں نہیں ہوتے۔ بچے جب تک بچے رہیں گے' اُن کے احساسات میں ذیل کے خصوصیات پائے جائیں گے :—

(۱) خود غرضی۔ بچہ اپنی ساری دنیا کا مرکز اپنی ھی ذات کو سمجھتا ھے۔ ایثار کا لفظ ابھی اس کے لیے بے معنی ھے۔ ایثار کی صفت بہت روز کے بعد رفتہ ھی رفتہ وجود میں آتی ھے۔ بچہ بچپن بھر اپنے احساسات کے لحاظ سے بجائے انسان کے حیوان سے زیادہ مشابہ ہوتا ھے۔ انسانیت کی تکمیل ابھی شروع ھی نہیں ہوئی ھے۔ اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی فوری تکلیف کے مقابلے میں دوسروں کی راحت کا خیال کرے گا' سرتاسر نادانی ھے۔ اُسے اپنے پیٹ

کے آگے کوئی چیز یاد نہیں رہتی، نہ ماں نہ باپ نہ دائی کھلائی۔

(۲) موجودیت - بچے کی احساس پزیری اُس کی عقل و فہم کے تابع ہوتی ہے اور یہ معلوم رہے کہ بچے کی عقل بہت محدود ہوتی ہے، جو چیز اس کے سامنے موجود، محسوس و مشاہد ہوتی ہے، وہ اُس سے متاثر ہوتا ہے، اور ماضی و مستقبل دونوں اُس کے لیے بہت ہی بعد رکھتے ہیں —— علم کی طرح احساس بھی بچے کا حضوری بہت زاید ہوتا ہے، اِستحضاری بہت کم -

(۳) شدت و حدت - بچے کی قوت ارادی ابھی کمزور ہے، اس لیے ضبط کی بھی ابھی اُس میں بہت کمی ہے - ساتھ ہی عقل بھی ابھی پختہ نہیں - اس لیے غور و فکر میں بھی ابھی بہت خامی ہے - احساسات میں اعتدال یہی دو چیزیں پیدا کرتی ہیں، اور چونکہ یہ دونوں ابھی خود بہت ضعیف ہیں، اس لیے قدرتاً بچوں کے احساسات بھی بہت شدید اور قوی قسم کے ہوتے ہیں -

(۴) زودفنائی - بچوں کے احساسات گو تیز اور قوی بہت کچھ ہوتے ہیں، لیکن دیرپا نہیں ہوتے - آندھی کی طرح اِدھر چڑھ کر آئے، اُدھر ہوا ہوگئے - عناد و کینے کی کیفیتیں جو دل کی گہرائیوں میں جڑ پکڑے ہوتی ہیں، اُن سے بچوں کے سادے احساسات نا آشنا ہوتے ہیں —— ننھے بچوں کو جو زرا سی بات میں بگڑتے اور پھر فوراً ہی بہل جاتے بھی دیکھا جاتا ہے، وہ اسی صورت حال کا کرشمہ ہے -

عقل کی طرح احساس میں بھی ارتقاء ہوتا رہتا ہے - اور یہ ارتقاء اس قاعدۂ عقلی و تجربی کا پابند ہے کہ جس نسبت سے ہم کسی شے کا علم رکھتے ہیں، اُسی نسبت سے اُس سے متاثر بھی ہوتے ہیں - علم ہی کی طرح، احساس کا نمو بھی سادہ سے مرکب کی طرف ہوتا رہتا ہے - اور اس میں تقویت مشق و تربیت سے ہوتی رہتی ہے - شروع شروع ہمارے احساسات تمامتر ہماری فوری اور براہ راست جسمانی ضروریات تک محدود رہتے ہیں، اور یکسر انفرادی و شخصی حیثیت کے ہوتے ہیں - رفتہ رفتہ اجتماعی وسعت اختیار کرتے جاتے ہیں - اور جو اعلی اخلاقی جذبات ہیں، وہ بہت بعد کی پیدائش ہوتے ہیں -

شیرخوارگی سے لے کر پیرانہ سالی تک کے احساسات کو اگر ہم منظم و مرتب کرنا چاہیں، تو طبقات ذیل نظر آئیں گے :-

(۱) نفسیاتی احساسات کا نمبر سب سے پہلے آتا ہے - شروع شروع بچے کا احساس صرف تغذیے کی ضروریات یعنی بھوک پیاس، اور حواسی احساسات تک محدود رہتا ہے - وہ سنتا ہے، دیکھتا ہے، بھوک پیاس کا اظہار چیخ چلا کر کرتا ہے - دکھ سکھ رنج و راحت محسوس کرتا ہے [۱] - غرض احساسات اِس سن میں سادہ ہوتے ہیں -

(۲) پھر جذبات پیدا ہوتے ہیں - ہر اِحساس کے ساتھ

[۱] اہل تجربہ کا بیان ہے کہ بھوک کا رونا اور ہوتا ہے درد یا تکلیف کا اور، دونوں کے درمیان فرق اس سن میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے -

اور اس کے متلازم، عصبی قوت کا بھی ایک ذخیرہ خارج ہوتا رہتا ھے، جس سے جسمانی حرکتیں واقع ہوتی ہیں - غم و غصہ، خوف و مسرت کے مظاہر جسمانی سے کون ناواقف ھے؟ ان جسمانی اثار و مظاہر سے اصل احساس کی قوت اور بڑھتی رہتی ھے - اور اسی نفسی احساس اور جسمانی مظہر کے مجموعے کا نام جذبہ ھے -

(۳) حافظہ (ماضی) اور تخیل (مستقبل) کی آمیزش سے احساسات کی قوت کہیں زیادہ ہوتی رہتی ھے - جو شخص ہمیں بار بار غصہ دلا چکا ھے، اُس کے تازہ غصہ دلانے پر ہمیں اس سے کئی گنا غصہ آجاتا ھے، جتنا بغیر اس پچھلے سابقے و تجربے کے آتا - کسی خوفناک جانور کو محض دیکھنے سے اتنا خوف طاری نہیں ہوتا، جتنا اِس علم کے بعد ہوتا ھے کہ وہ جانور اس حد تک خطرناک بن سکتا ھے ——— غرض ان منزلوں پر پہنچ کر احساسات محض حضوری نہیں رہتے، استحضاری جزو ان میں نمایاں طور پر شامل ہو جاتا ھے -

(۴) علم و قوت کی طرح احساس کی قوت بھی مشق و تربیت ھی سے بڑھتی ھے - ہر پچھلا احساس گو شعور میں نہ باقی رھے، پھر بھی کسی درجے میں اپنا اثر لاشعوریت میں ضرور چھوڑ جاتا ھے - اور اسی کی بنیاد پر احساسات کی عادتیں قائم ہوتی رہتی ہیں ——— فیاض ہم ایک دن میں نہیں بن سکتے - فیاضی ہر روز سیکھتے ھی رہنے، ہر روز اس کی مشق و تربیت ھی سے آسکتی ھے -

ان قاعدوں کی روشنی میں یہ بھی صاف نظر آجائیے گا، کہ

ارتقائے احساسات کی تاریخی ترتیب اگر مرتب کرنا ہے تو ترتیب حسب ذیل ہی قائم ہوگی :-

(۱) انفرادی احساسات - پہلا دور اُن احساسات کا ہوتا ہے، جو تمامتر بقائے حیات یا غیروں سے مدافعت میں مفید ہوتے ہیں - ان کا تعلق سادہ لذات اور سادہ آلام سے ہوتا ہے - ان احساسات کے نام ماہرین فن نے یوں گنائے ہیں :-

خوف، غصہ، مخالفت، اختیارپسندی، رقابت، دادطلبی، خودپسندی -

یہ فہرست ظاہر ہے کہ خود غرضی کی مختلف شکلوں پر شامل ہے - بچپن میں غلبہ انھیں کیفیات کا رہتا ہے، کہ وہی زمانہ ان کے خاص نشوونما کا ہوتا ہے -

(۲) اجتماعی احساسات - رفتہ رفتہ بچے کو اس کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایک حیوان عمرانی یا مدنی الطبع ہے - اور اس کو معاشرے میں دوستی اور رفاقت کے تعلقات قائم کرنے ہیں - یہیں سے ایثاری جذبات کی بنیاد پڑتی ہے - اس دور کے احساسات میں نام محبت، ادب، ہمدردی کے لیے گئے ہیں -

(۳) اخلاقی جذبات — ان کی تحلیل اِن تین تحتانی عنوانات میں کی گئی ہے :-

(الف) حق شناسی - اور اس کے متعلقات

(ب) جمال شناسی - اور اس کے متعلقات

(ج) فرض شناسی - اور اس کے متعلقات

تربیت احساسات کا لحاظ اگر بچپن ہی سے نہ رکھا

جائیگا تو بچے اُداس اور مضمحل رہنے لگیں گے - اور اس کا اثر اُن کے سارے نشو و نمائے دماغی پر پڑے گا - محرک عمل تو احساسات ہی ہوتے ہیں - اور کردار کی پختگی کی بنیاد آخر میں انھیں پر آکر پڑتی ہے - بچوں کی خود پرستی کی بنا پر اور زیادہ ضرورت تربیت احساسات کی ہے - پھر احساس کا اثر متعدی بھی ہوتا ہے - صحبت سے منتقل ہوتا رہتا ہے - بچپن ہی سے خودغرضی اور خودپرستی کو اگر قابو میں نہ کیا گیا، تو یہ مرض بڑھتے رہیں گے اور زیادہ عمر پر پہنچ کر بھی مشکل ہی سے ان سے چھٹکارا مل سکیگا ' اگرچہ بچپن میں بھی اُن کے دبا دینے کی کوشش بہت زیادہ کرنا صحیح نہیں' اور نہ اس میں پوری کامیابی ہی ہوسکتی ہے - اس لیے کہ بچے کا ارادہ بھی تو ابھی کمزور ہوتا ہے -

احساسات کی تربیت کے سلسلے میں امور ذیل کا لحاظ رکھنا ضروری ہے :-

(۱) احساس کی تربیت عموماً بالواسطہ ہی ہوسکتی ہے - کوئی فاسد احساس جس غلط علم یا غلط توقع کی بنا پر قائم ہوا ہے' اس بنا ہی کو ہدم کر دینا بہت بہتر ہوتا ہے —— چوری کا جذبہ ایک خیالی نفع سے پیدا ہوتا ہے - چوری اگر چھڑانا ہے' تو اُس نفع ہی کے خیالی قلعہ کو مسمار کرنا ہوگا -

(۲) احساسات عموماً مرکب و پیچیدہ ہوتے ہیں - سادے اور بسیط احساسات تو صرف ابتدائی بچپن کے ساتھ مخصوص ہیں - دنیا کو سابقہ عموماً مرکب اور پیچیدہ احساسات سے پڑتا رہتا ہے - اصلاح و تربیت میں اس نوعیت احساسات کا خیال

رکھنا مقدم ہے -

(۳) ہر احساس رفتہ رفتہ خود ایک مقصود بن جاتا ہے - کوئی احساس جب پختہ ہو گیا ' تو اب اس سے بحث نہیں رہ جاتی کہ اس سے انبساط یا انقباض کتنا حاصل ہوتا ہے - لذت و الم دونوں سے قطع نظر' اب ایک خاص قسم کا جوش خود اس احساس کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے ' اور اس سے جدا نہیں ہو پاتا -

(۴) احساس کی اصلاح و تربیت میں عملی مثال زبانی نصیحت سے زیادہ کارگر ہوتی ہے ---- اگر کسی کو فیاضی کی تربیت دینا ہے ' تو بہتر یہ ہوگا کہ اُسے فیاضوں کے درمیان رکھا جائے ' جہاں ہر وقت جود و سخا کی عملی مثالیں اُس کی نظر سے گزرتی رہیں -

(۵) تربیت احساس میں ترتیب کا سوال بہت اہم ہے - اور بچپن میں اثبات پر نفی ' اور ایجاب پر سلب مقدم ہے ---- چھوٹے بچوں کو خودغرضی کے مظاہروں سے روکنا زیادہ ضروری ہے بہ مقابلہ ایثاری مشقوں کی تاکید کے -

(۶) جس طرح بچپن میں نامناسب احساسات کا دبانا ہی مفیدتر ہے ' اُسی طرح بڑوں کے مناسب احساسات کو اُبھارنا مفیدتر ہوگا - اور اُسے قوت ' مشق اور عملی نمونوں اور عقل و فہم سلیم سے پہنچ سکتی ہے -

---

اوپر کی تشریحیں اور تشخیصیں اگر صحیح ہیں تو بچوں کی تربیت احساس سے متعلق حسب ذیل عملی ہدایتیں

بھی حاصل کی جاسکتی ہیں :-

(۱) بہت زیادہ ڈانٹ ڈپٹ سے بچوں کے احساسات مردہ ہو جاتے ہیں، اور اُن میں غیرت باقی نہیں رہ جاتی ــــ کسی بڑے کو بھی اگر بار بار اور سب کے سامنے بیوقوف، پاجی، گدھا، نابکار وغیرہ الفاظ سے یاد کیا جائے، تو اس میں احساس کمتری پیدا ہو جائے گا۔ وہ سمجھنے لگے گا کہ میں تو ہوں ہی اِن الفاظ سے مخاطب کئے جانے کے قابل، اور اپنی کوتاہیوں کے رفع کرنے کا خیال ہی اُس کے دل سے مٹ جائے گا۔ تو بچوں کے لیے تو اِس کی احتیاط اور زیادہ رکھنی ضروری ہے۔

(۲) احساس کی تربیت کے ساتھ ساتھ قوائے عقلی کی بھی بیداری کی فکر رکھنا چاہیے ــــ دونوں میں عموماً چولی دامن کا ساتھ رہتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے جذبات میں جو دوسروں کے ساتھ قوی ہمدردی کے بجائے سردمہری نظر آتی ہے، اُس کی تہ میں اکثر تخئیل کی کمی ہی نکلتی ہے۔

(۳) بچوں کو انعام کا، مٹھائی کا لالچ، بہت زیادہ دلانا ان کے مستقبل کو مستقل طور پر خراب کر دیتا، اور انھیں رشوت کا عادی بنا دیتا ہے۔

(۴) اُستاد کا یا باپ کا بچوں پر اپنا رعب و داب بہت زیادہ قائم رکھنا بھی مضر ہے۔ اس کی کوشش کرنا کہ بچے بڑوں کے سامنے نہ بول سکیں نہ ہنس سکیں نہ اپنی جگہ سے ہل سکیں، بلکہ گم سم بت بنے بیٹھے رہیں، نفسیات بشری سے بالکل بیگانگی کا ثبوت دیتا ہے ــــ اطاعت کا مادہ بھی

سن و سال کے متناسب ہی ہوتا ہے۔

(۵) بھوت، پریت، چڑیل، آسیب وغیرہ کی ہیبت بچہ کے دل میں بٹھا دینا اس کے ساتھ دوستی نہیں، دشمنی کرتا ہے۔ بچپن کی بیٹھی ہوئی ہیبت، بڑے ہوکر بھی مشکل ہی سے نکل سکے گی، اور لڑکا ساری عمر خیالی ڈراؤں کا شکار رہے گا۔

(۶) بچپن میں بے خیالی، بے فکری، غیر ذمہ داری قدرتاً بڑھی ہوئی ہوتی ہے، تربیت احساس ایسی نہ ہو کہ یہ کیفیتیں اور زیادہ بڑھ جائیں۔ رفتہ رفتہ لااُبالی پن کو ذمہ داری سے بدلنا چاہیے، نہ کہ اس کے برعکس۔

(۸) ساری تربیت اس طرح کی ہو کہ لڑکے کے نفس میں غیرت، حمیت، خودداری کے جذبات کو ترقی رہے، نہ کہ اس کے برعکس اُنھیں توڑے، اُسے پست ہمتی کا خوگر کردے۔

———

اٹھواں باب

بھول چوک

عدالت کی سیر کا کبھی آپ کو اتفاق ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، بہر حال خیالی سیر میں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ دیکھیے مجسٹریٹ صاحب کے اجلاس پر ایک فوجداری کا مقدمہ پیش ھے۔ گواہ کا اظہار ہوچکا ھے، اور اب فریق مخالف کے وکیل صاحب جرح کر رھے ھیں :-

وکیل — اچھا تو جب آپ کمرے میں داخل ہونے لگے، تو دروازہ آپ نے بند پایا تھا ؟

گواہ — جی ھاں -

و — یہ آپ کو علم کیسے ھوا ؟

گ — علم کا کیا سوال ھے، میں خود کھول کر اندر گیا -

و — تو آپ کو دروازے کا کھولنا خوب یاد ھے، کوئی شبہہ تو اس میں نہیں ؟

گ — دروازہ اگر میں کھولتا نہیں، تو آخر اندر جاتا کیسے ؟

و — جواب میں اگر مگر نہ لگائیے - مہربانی کرکے سیدھا، قطعی جواب اس سوال کا دیجیے، کہ دروازہ آپ نے کھولا تھا ؟ دروازے کی کنڈی کھولنا آپ کو خوب یاد ھے ؟

گ — اتنی تفصیل تو مجھے یاد نہیں - بیان حلف سے دے رہا ہوں ' اسے قطعی طور سے کیسے کہدوں - بہر حال کنڈی کھولی ہی ہوگی - جب تو اندر گیا -

و — دیکھیے ' کمرے کے دروازے کے بیچ میں کنڈی ہے ' اور اوپر کے حصے میں سٹکنی لگی ہوئی ہے - ہو سکتا ہے کہ آپ نے کنڈی کھولی ہو ' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے اوپر کی سٹکنی گرائی ہو - اور یہ بھی ممکن ہے کہ کواڑ محض اٹکے ہوے ہوں - سٹکنی ' کنڈی کچھ بھی نہ لگی ہو -

گواہ بیچارہ اب ست پٹا سا گیا - اس کے وہم میں بھی یہ نہیں آیا تھا کہ ایک زرا سی بات میں اتنی شقیں نکلنے لگیں گی - شریف سچا آدمی تھا - نہیں چاہتا تھا کہ زبان پر کوئی ہلکی سی بھی غلط بات آئے - آخر چند سکنڈ رک کر بولا ' کہ

" اتنی جزوی تفصیل تو اب مجھے یاد نہیں "

وکیل صاحب نے گویا پالا مار لیا - کچھ اور بیانات لینے کے بعد عدالت سے مخاطب ہو کر کہا کہ " گواہ کا حافظہ قابل اعتبار نہیں ' —— عدالت کے کمرے کے اندر یہ تجربہ کوئی نیا یا انوکھا نہیں - روزمرہ نہ معلوم کتنے اچھے جید حافظہ رکھنے والوں کے حافظے یوں ہی مجروح ہوا کرتے ہیں !

حافظے کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو واقعات جس ترتیب زمانی کے ساتھ پیش آتے ہیں ' اُنھیں ٹھیک اُسی ترتیب کے ساتھ دھرایا جائے - اور یہ معنی ہیں بھی ٹھیک - لیکن اگر خاص طور پر پہلے سے لحاظ نہیں رکھ لیا گیا ہے ' تو عموماً

ہوتا یہ ہے کہ تفصیلات و جزئیات میں ذہن گڑ بڑا جاتا ہے، اور بجائے قوت حفظ پر اعتماد کامل کے تخیل کا سہارا ڈھونڈنے لگتا ہے ۔ قرینہ اور قیاس بیشک تفصیلات کو بھی ایک خاص و متعین ہی صورت میں چاہتا ہے، لیکن یہ عقل اور تخیل کی کارفرمائی ہوئی ۔ قوت حفظ کا عمل نہ ہوا ۔

عموماً ہر پچھلے واقعے کے دہرانے، ہر روایت بیان کرنے، ہر شہادت دینے میں حفظ کے ساتھ تخیل کا میل جول ناگزیر ہوتا ہے ۔ بغیر تخیل کی آمیزش کے کام چلتا نہیں ۔ فرق نفسیاتی حیثیت سے دونوں میں یہ ہے کہ حفظ والے اجزا میں گزرے ہوئے واقعے کو ہم صرف پہچانتے ہیں، ایک جانی ہوئی چیز کی گویا شناخت کر لیتے ہیں ۔ اصل شے بجنسہ گویا صرف دہرا دی جاتی ہے ۔ تخیل والے حصے میں، اصل و نقل کے درمیان ایجاد نہیں ہوتا، صرف مشابہت یا مماثلت ہوتی ہے ۔ ذہن ربط پیدا کرنے کے لیے حافظے سے چھوٹتے ہوئے جزئیات کو اپنی طرف سے فرض کر لیتا ہے، اور اسی طرح پورا واقعہ ایک بالکل مرتب، مربوط و مسلسل صورت میں نظر کے سامنے آجاتا ہے ۔

حافظہ اور تخیل ان دونوں قوتوں میں حافظہ یقیناً اہم تر اور قدیم تر ہے ۔ حفظ کی قوت اگر بالکل شروع ہی سے کارفرما ہوتی، تو نہ مزید ذہنی تجربات کا سلسلہ چلتا، نہ انسان کی شخصیت ہی بن پاتی ۔ اور تو اور ہم خود اپنے سے کب واقف ہو پاتے؟ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوتا، کہ آپ جو اس وقت یہ کتاب پڑھ رہے ہیں، وہ وہی ہیں جو آدھ گھنٹہ قبل کھانا کھا رہے تھے؟ ہمیں یہ کیونکر یقین ہوتا، کہ ہم وہی

ہیں، جو ایک زمانے میں اردو کی پہلی کتاب پڑھ رہے تھے؟ اگر قوت حافظہ کو منفی کر لیا جائے، تو اس قسم کے سوالات بے جواب رہ جائیں گے - ماضی قریب اور ماضی بعید کے درمیان فرق یقیناً ہے، اور زمانے کا فصل جتنا بڑھتا جائے گا، پچھلے نقش اسی نسبت سے دھندلے پڑتے جائیں گے - حافظہ پورا ساتھ نہ دے سکے گا - اور خلاء کو پر کرنے کے لیے تخیل سے مدد لینے کی ضرورت بڑھتی جائے گی - اور واقعات کا جتنا جزو محض حافظے پر مبنی ہو گا، وہ وزن اُس سے کہیں زیادہ رکھے گا جس میں آمیزش تخیل کی ہوگی -

حافظے میں جو کچھ بھی آتا ہے وہ گویا بہ قید تاریخ آتا ہے - اور جب ہم ان گزشتہ واقعات کو یاد کرتے ہیں، تو وہ ذہن کے سامنے قدرتاً اُسی تاریخی یا زمانی ترتیب کے ساتھ آتے ہیں، - حفظ کرنے کے معنے یہ ہیں کہ اُن واقعات یا الفاظ کو ذہن کے سامنے باربار، اتنی تعداد میں دہرایا جائے، کہ ان کا وہی نقش بجنسہ ذہن پر جم جائے - اِسی کو ازبر کر لینا کہتے ہیں - محض علم حاصل کر لینے میں یہ کیفیت ذہنی نہیں ہوتی - علم حاصل کرنے میں معلومات کا نقش ذہن میں آ ضرور جاتا ہے، لیکن ٹھیک اُسی تاریخی یا زمانی ترتیب کے ساتھ نہیں آتا بجنسہ اسی زمانی ترتیب کا اجزائے معلومات میں باقی رہنا ہی جوہر ہے حفظ کا - بعض لوگ رٹنے کو بہت حقارت سے دیکھتے ہیں، اور رٹے ہوئے علم کو بالکل بے حاصل سمجھتے ہیں - یہ کلیہ صحیح نہیں - جہاں صرف معنی و مفہوم ہی ذہن نشین کرنا ہو، وہاں حفظ

پر زور دینا یقیناً بے محل، بلکہ بعض حالات میں مضر ہے۔ لیکن جہاں اس کے علاوہ لفظ و عبارت بھی مقصود بالذات ہو، وہاں رٹنا بے محل نہیں، بامحل و مفید ہے ــــ غالب کا، حافظ کا کوئی شعر، شیکسپیر کی، کالی داس کی کوئی بیت سنانے لگیے، اور درمیان میں کوئی لفظ چھوڑ جائیے، تو اُس کی ساری خوبی ہی غارت ہو جائے گی۔ جو عبارت جتنی زیادہ فصیح و بلیغ ہوگی، اُسی قدر اُسے بجنسہ محفوظ کر لینا بہتر ہوگا۔

نفسیات کے جو باقاعدہ طلبہ ہیں اُنھیں چھوڑیے۔ ان کے لیے تو فن کا ایک ایک جزئیہ قابل قدر ہے۔ لیکن عام لوگوں کے لیے خاص دلچسپی اور توجہ اور کام کی چیز یہی حافظے کا باب ہے۔ سب کا اس سے کام پڑتا ہے۔ اور حافظے کو مرکزیت ہی ایسی حاصل ہے۔ حافظے کے اسی عملی افادے کے لحاظ سے بہت سے لوگوں نے مصنوعی طریقے حفظ و استحضار کے ایجاد کر لیے ہیں۔ سب سے زیادہ چلی ہوئی چیز حساب کے پہاڑے ہیں، جو بچپن ہی میں رٹا دیے جاتے ہیں، اور آگے چل کر بہت ہی کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ موزوں اشعار اور مقفی فقرے بھی اسی غرض کے لیے بہت سے لوگوں نے ایجاد کر لیے ہیں۔ حفظ میں ان سے بڑی مدد مل جاتی ہے ــــ اسکول کے زمانے میں تاریخ ہند کے پرچے میں اکثر سوال یہ آ جاتا، کہ ہندوستان کے گورنر جنرلوں کے نام بتاؤ۔ اس کے لیے کسی نے اُس وقت تک سب گورنر جنرلوں کے نام نظم میں موزوں کر دیے تھے۔ پہلا شعر یہ تھا۔

ہیسٹنگز و میکفرسن کارنوالس جان شور
مارکوئیس ویلزلی و کارنوالس پھر ہ جورج

یہ شاعری محض تک‌بندی سہی، بہر حال حافظے کے لیے معین تھی - کالج میں جب منطق کا کورس لیا، تو اسی قسم کی لاطینی نظمیں منطق کے ضروب (Moods) و اشکال (Figures) کو یاد کرانے والی ملیں -

Barbara, Celarent, Darii, Fereoque وغیرہ

نارنگی اس وقت آپ کے سامنے موجود نہیں، لیکن بہر حال بارہا کی دیکھی ہوئی ہے - اب آپ زرا یاد تو کیجیے، نارنگی کیسی ہوتی ہے - ذہن کے سامنے سب سے پہلے تو ایک رنگ آتا ہے، سرخ نارنجی قسم کا - معاً یہ بھی خیال میں آ جاتا ہے، کہ شکل گیند کی سی تھی - اور جسامت بھی چھوٹے گیند ہی کی تھی - اور ساتھ ہی اُس کا مزہ، اُس کی خوشبو، اُس کی تری، یہ سب چیزیں بھی ذہن میں تازہ ہو جاتی ہیں —— اب ذہن میں نارنگی کا مکمل "تصور" آ گیا، جو نارنگی کی جسمانی مادی "تصویر" سے بالکل الگ ہے - جب نارنگی آنکھ کے سامنے ہوتی ہے، تو اُس کی براہ راست تصویر ذہن میں ہوتی ہے، اور جب وہ سامنے موجود نہیں ہوتی، محض اُسے یاد کرنا پڑتا ہے، تو اب اُس کا محض تصور ذہن میں آتا ہے -

تصویر اور تصور کے اِس اصولی فرق سے اُن کے یہ امتیازی خصوصیات بھی پیدا ہوتے ہیں:-

(۱) وضاحت - تصویر خوب واضح ہوتی ہے، براہ راست

ایک چیز سامنے موجود ہی ہے - تصویر میں اتنی وضاحت نہیں ہوتی - کچھ نہ کچھ دھندلا پن رہ جاتا ہے -

(۲) خارجیت - تصویر اشیاے خارجی سے وجود میں آتی ہے - تصور کے لیے اشیاے خارجی کی ضرورت نہیں -

(۳) ارادیت - تصویر کے لیے ارادے کی ضرورت نہیں، آنکھ کھلی ہے تو سامنے کی چیز خواہ مخواہ نظر آ جائے گی، ہم ارادہ کریں یا نہ کریں - تصور زیادہ تر ارادے ہی سے وجود میں آتا ہے -

(۴) سرعت - تصویر بہ سرعت تمام شعور کے سامنے آ سکتی اور سامنے سے جا سکتی ہے - تصور کی آمد و رفت عموماً تدریجی ہوتی ہے -

(۵) حضوریت - تصور کا علم حضوری ہوتا ہے، تصور کا استحضاری -

تصور گویا تصویر کے استحضار کا نام ہے - لڑکے جب تک سبق پڑھتے ہوتے ہیں، شعور تصویری ہی سے کام لیتے رہتے ہیں، دوسرے وقت جب وہ سبق سناتے ہیں، تو اب ان کا شعور تصوری ہو جاتا ہے -

حافظے کا ہر عمل دو مفرد اعمال کا مرکب ہوتا ہے - ایک کسی واقعے یا علم کا حصول یا اکتساب، دوسرے اس کا بہ وقت ضرورت اعادہ یا استحضار - اور ان دونوں کے درمیان ایک تیسری کیفیت اس واقعے یا علم کی محفوظیت یا مخزونیت کی ہوتی ہے ـــــ تو اب گویا ہر عمل حفظ کی یہ تین منزلیں ہوئیں :-

(۱) سب سے پہلے کسی علم کا اکتساب یا حافظے میں استقرار -

(۲) دوسرے، حافظے میں اس کا استحفاظ -

(۳) تیسرے، وقت پر اس کا اعادہ یا استحضار -

جدید ماہرین فن کہتے ہیں، کہ حافظہ نفس کی قوتوں میں سے کوئی علیحدہ و مستقل قوت نہیں، نفس کی عام فعلیت ہی کا نام ہے - حافظہ اور توجہ اگر نہ ہوں، تو نفس کی کوئی فعلیت صادر بھی نہ ہو پائے ——— اور یہاں پہنچ کر اگر حافظے کی کوئی تعریف مرتب کرنا چاہیں، تو کہہ سکتے ہیں، کہ نفس جب یوں عمل کرتا ہے کہ اپنے حاصل کئے ہوے اور محفوظ کیے ہوے معلومات کو دھرانے لگتا ہے، تو اسی کا نام حافظے سے کام لینا ہے -

لیکن آخر اتنے وقت تک یہ معلومات رہتے کہاں ہیں ؟ براہ راست شعور کے سامنے رہیں، تو پھر اعادہ کا سوال ہی کہاں سے پیدا ہو، اور دو بارہ لائے کہاں سے جائیں ؟ ظاہر ہے کہ براہ راست شعور کے سامنے نہیں ہیں - اس شعور متعارف کے سوا ایک شعور خفی یا تحت الشعور بھی ہے - اتنے وقت تک یہ معلومات اسی میں رہتے ہیں - اس شعور خفی کی قوت ہر وقت اور ہر حال میں یکساں نہیں رہتی - عام بیداری اور تندرستی کی حالت میں یہ خفیف ہی رہتی ہے - نیند کے وقت اور بعض بیماریوں میں بڑھنے لگتی ہے - گہری نیند کے وقت یہی تمامتر شعور جلی پر غالب آ جاتی ہے -

اس شعور خفی کی تہیں مختلف ہوتی ہیں - بعض پچھلے

واقعات و معلومات اس کی عین سطح پر رہتے ہیں، جہاں اس کے دائندے شعور سے ملے ہوئے ہوتے ہیں - ایسے واقعات ادنیٰ سی کوشش کے بعد فوراً اور برجستہ یاد پڑ جاتے ہیں، کچھ واقعات نیچی تہوں میں ہوتے ہیں، اور بہ دقت یاد ہوتے ہیں - اور جو واقعات سب سے زیادہ گہری تہوں میں جا پڑتے ہیں، وہ ہزار کوشش کے بعد کسی طرح یاد نہیں آتے - لیکن ایسا واقعہ تو کوئی بھی نہیں ہوسکتا، جو کسی حال میں بھی مستحضر نہ ہو سکے - ضرورت صرف قوی‌ترین محرکات اور موثرترین مہیجات کے استعمال کی پڑے گی -

جو واقعات برجستہ یاد آ جاتے ہیں، اُن کے لیے ہماری زبان میں محاورہ یاد "پڑ جانے" کا ہے ——— اِدھر کسی نے اولاد کے سامنے ماں باپ کا نام دھرایا، اُدھر اولاد کو اُن کی شکل و صورت پوری طرح یاد پڑ گئی - اور اس میں نہ کوئی اشتباہ ہوتا ہے اور نہ کوئی دقت -

اب ایک مثال "یاد دلانے سے یاد آ جانے" کی بھی ملاحظہ ہو - ایک اسکول کے لڑکے سے تاریخ ہند کے گھنٹے میں اُستاد سوال کرتا ہے کہ ہندوستانی سپاہ کا وہ ہنگامہ کس سنہ میں ہوا تھا، جسے انگریز مورخ غدر سے موسوم کرتے ہیں؟ لڑکا جواب میں سوچنے لگتا ہے - اُستاد کہتا ہے، "اچھا یہ تو بتاؤ کہ اُس وقت ہندوستان کا گونر جنرل کون تھا"؟ لڑکا کہتا ہے - لارڈ کیننگ - اُستاد کہتا ہے "اُن کے زمانۂ حکومت کے سنہ یاد ہیں"؟ لڑکا کہتا ہے ۱۸۵۲ تا ۱۸۵۸ - اُستاد کہتا ہے "اب کیا مشکل رہی؟ اب تو قریب آ گئے ہو" - لڑکا کہتا ہے

(رک رک کر) "۱۸۵۹ - (تیز ہو کر) جی نہیں ۵۷" اب یاد آ گیا سنہ ۵۷ ء" ——— جو معلومات ذہن میں پختہ طور پر حفظ بھی نہیں ہوتے، وہ یوں اتا پتا بتانے سے یاد آ جاتے ہیں - مسلمان لڑکوں نے دیکھا ہوگا کہ نماز تراویح میں جب امام کو اشتباہ ہونے لگتا ہے، تو پیچھے سے سمجھدار حافظ صرف بہ قدر ضرورت لقمہ دیتا ہے، اور اس پر امام آگے چل نکلتا ہے - یہ عمل بھی اسی یاد دلانے کی ہے -

یاد کرنے اور یاد پڑ جانے میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ یاد کرنے میں کوشش کرنی پڑتی ہے، یعنی توجہ ارادی کرنی ہوتی ہے اور یاد پڑ جانے میں کوشش کا جزو مفقود یا تقریباً مفقود ہوتا ہے - یعنی توجہ اضطراری سے کام چل جاتا ہے ——— اس تفریق کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ پہلا عمل حافظہ انفعالی کا ہے، ارر دوسرا حافظہ فعلی کا -

یاد کرتے وقت، قوت ارادی اپنا عمل توجہ کے واسطے سے کرتی ہے - نفس اپنے میں یکسوئی و مرکزیت پیدا کرنا چاہتا ہے، ہر انتشاری جزو کو اپنے سے خارج کرنے لگتا ہے، اور جس نام یا عبارت یا واقعے کی تلاش ہوتی ہے، اس نوعیت کی کوئی دھندلی سی تصویر اس کے سامنے موجود ہوتی ہے ——— ان ذہنی کیفیات کا پرتو جسم پر یہ پڑتا ہے کہ جسم بے حس و حرکت ساکن و ساکت ہو جاتا ہے، نگاہ ایک طرف گڑ جاتی یا جم جاتی ہے، اور ہونٹھ اندر کی طرف کس جاتے ہیں -

---

یاد کرنے اور یاد پڑ جانے کا اصولی فرق معلوم ہو چکا

بہتر ہوگا کہ زندگی کے چند تجربات پر انہیں اور منطبق کر کے دیکھا جائے۔

(۱) اپنی والدہ مرحومہ کو حالت نزع میں جس طرح دیکھا تھا، برسوں ہو گئے اور وہ کیفیت بھولنے میں نہیں آتی۔ توقع یہ ہے کہ اپنی آخر عمر تک یاد رہے گی۔

(۲) بچپن میں حساب کے جو پہاڑے، شاعروں کا جو کلام، قرآن کی جو سورتیں یاد کر لی تھیں، وہ آج تک خوب پختہ یاد ہیں۔ بعد کو جو کلام یا علوم و فنون کے جو مسائل یاد کرنے چاہے، وہ کچھ کچے ہی سے یاد ہوئے۔

(۳) کل ایک صاحب نے کہا کہ کنھیا لال آپ کے ایک پرانے ملنے والے ہیں۔ نام سے کچھ خیال تو آیا۔ انھوں نے فوٹو نکال کر دکھایا۔ سب یاد پڑ گیا کہ ان کا تو فلاں زمانے میں فلاں اسکول میں مدت تک ساتھ رہا تھا۔

(۴) ریڈیو کے لیے تقریر آج غالب پر تیار کرنی تھی۔ اُن کا زمانہ، اُن کا کلام، اُن کی نثرنگاری بہت کچھ ذہن میں تھی۔ پھر بھی بہت سی باتیں ذہن سے نکل چکی تھیں۔ یادگار غالب، غالب نامہ وغیرہ کی سرسری اُلٹ پلٹ سے جیسے وہ ساری چیزیں پھر "تازہ" ہو گئیں —— شیخ علی حزیں، ملٹن، یا کالی داس سے متعلق اتنے معلومات اتنے سرسری مطالعے کے بعد ہرگز ذہن میں نہ آ جاتے۔

(۵) آج ۸ جنوری سنہ ۱۹۴۶ع ہے۔ ۵ جون سنہ ۱۹۳۵ع کو یا ۳ جنوری سنہ ۱۹۳۲ع کو کیا کھایا تھا، کیا پیا تھا، کہاں رہا تھا، کس کس سے ملاقات ہوئی تھی، کیا کیا باتیں ہوئی

تھیں، رات میں کتنی دیر سویا تھا، ہزار کوشش پر بھی یہ جزئیات کسی طرح یاد نہیں پڑ رہے ہیں -

ان پانچ مثالوں سے حفظ و سوء حفظ کی مثالیں چار قسم کی برآمد ہوئیں :-

(الف) (۱) و (۲) مثالیں حفظ صحیح کی ہیں -

(ب) (۳) مثال حفظ ناقص کی ہے -

(ج) (۴) مثال نسیان جزئی کی ہے -

(د) (۵) مثال نسیان کلی کی ہے -

اب ایک ہی واقعے سے مثالیں چاروں قسم کی اخذ کر لیجیے :-

استاد کلاس میں لکچر دے رہا ہے - درجہ خاصہ بڑا ہے - چند خوش‌فہم و خوش‌حافظہ لڑکے سکون و توجہ کامل سے سن رہے ہیں - یہ لڑکے پورا سبق اپنے لفظ و عبارت میں دہرا دیں گے -

کچھ اور لڑکے ایسے نکلیں گے - جنھوں نے سبق سنا تو بڑی توجہ سے ہے، لیکن وہ اتنے خوش‌فہم و خوش‌حافظہ نہیں - اُنھیں زرا تھیلنے اور سہارا دینے کی ضرورت ہو گی - کوئی یاد دلاتا جائے، تو اُنھیں بھی سبق یاد نکلے گا -

ایک تیسرا طبقہ ایسا ہو گا، جو یاد دلانے پر بھی کچے نکلیں گے - یہ نہ بہت زیادہ خوش‌فہم و خوش‌حافظہ ہیں، اور نہ انھوں نے سنا ہی پوری توجہ و سکون کے ساتھ ہے -

آخری طبقہ اُن بدشوق و بدحافظہ لڑکوں کا نکلے گا، جنھوں نے سبق سننے میں توجہ سے بھی کام نہیں لیا، یہ بالکل

کورے رہے - یہ کچھ بھی نہ بتا سکیں گے -

مثالیں گزر چکیں - اب دیکھیے کہ ان کی مدد سے عملی نتیجے کیا کیا نکلتے ہیں، اور حفظ و نسیان سے متعلق کلیے اور ضابطے کیا کیا ہاتھ آتے ہیں -

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ نفس پر نقش جس قدر گہرا بنے گا، اُسی نسبت سے وہ واقعہ محفوظ بھی زیادہ رہے گا -

والدہ کی نزع کی کیفیت کا نقش نفس پر اتنا گہرا پڑا، کہ زمانہ گزرنے پر بھی زایل نہیں ہوتا -- رہا یہ کہ فلاں سنہ کے فلاں دن اور تاریخ میں کھایا اور پیا کیا گیا تھا، ملے کس کس سے تھے، باتیں کیا کیا ہوئی تھیں، رہے کہاں تھے، اِن روزمرہ کی چیزوں کے نقش اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ گویا پیدا ہوتے ہی مٹ جاتے ہیں ——— گہری روشنائی سے قلم دبا کر لکھیے، عبارت کے نقش مدتوں محفوظ رہیں گے - ہلکی پنسل سے ہاتھ ہلکا کر کے لکھیے، تحریر بغیر ربر کے بھی خود ہی کچھ عرصے میں مٹ جائے گی -

(۲) دوسری چیز اُس نقش کی تکرار مناسب موقعوں کے ساتھ ہے -

نقش بہت گہرا نہ ہو، معمولی ہو - لیکن بار بار اگر اُسے دہرایا جائے، تو وہ بھی اُسی قدر پائدار، مضبوط و محفوظ ہو جائے گا - لیکن تکرار کے موثر ہونے کے لیے محض کثرت تعداد و شمار کافی نہیں - مناسب موقعوں، مناسب حال وقفوں کی قید بہت ضروری ہے ——— ایک نظم اگر یاد کر لینا مقصود ہے، تو اُسے آج یاد کیجیے، اور ۱۵ دن تک روزانہ دہرا

لیا کیجیے، یہ حفظ میں کہیں زیادہ معین و موثر ہوگی، بہ مقابلہ اِس کے کہ اُس نظم کو بجائے روزانہ کے پندرھویں دن اٹھا کر دیکھیے - اور اسے ۲۰ بلکہ ۲۵ پندرھویوں تک جاری رکھیے! ـــــ

پانی کا بند اگر باندھنا ہے تو مٹی یا چونا یا اینٹ پتھر مسلسل ڈالیے - یہ نہیں کہ مٹی کی ایک ٹوکری تو آج ڈالی گئی، اور دوسری ایک ہفتے کے بعد - اتنا طویل وقفہ تو کوشش کا اثر ہی زائل کر دے گا -

(۳) تیسری شرط نفس کی تیاری اور تاثر ہے -

والدہ کی نزع کا اتنا گہرا نقش اولاد ہی پر تو پڑا، غیروں پر نہ پڑا - واقعہ ایک ہی ہو، لیکن واقعہ بینوں میں سے جو جتنے تاثر سے اسے دیکھے گا، اُسی نسبت سے نقش بھی وہ گہرا قبول کرے گا -

(۴) بڑا دخل قانون ائتلاف کی کارفرمائی کو ہوتا ہے -

گنہیا لال کا نام سننے سے ذہن اُدھر بالکل نہ منتقل ہوا، سمعی حافظہ نے جواب دے دیا - جب ان کا فوٹو باصرہ کے سامنے آیا، تو بصری حافظہ میں جتنی مثالیں جمع تھیں، اُن میں سے ایک سے یہ فوٹو بالکل مل گیا، اور وہ ذہنی تمثال اسی نام والے شخص کی تھی - بس اس فوٹو نے وہ قصے تازہ کر دیے جو اُن صاحب کی تمثال ذہنی کے ساتھ وابستہ تھے -

قانون ائتلاف کی بھی خاص شکلیں دو ہیں :-

(الف) ایک ائتلاف بذریعۂ مشابہت یا مماثلت -

(ب) دوسرے ائتلاف بذریعۂ مقارنت یا اتصال زمانی -

اور بعض نے ان کے علاوہ ایک تیسری صورت، ائتلاف بذریعۂ تضاد بھی شمار کی ھے ـــــــــ جیسے "سخت" سے "نرم" کی اور "گرم" سے "سرد" کی طرف ذہن کا منتقل ہونا۔

ائتلاف، کو ٹھیٹھ اردو میں سمجھنا چاہیں، تو کہیں گے ایک چیز کا دوسرے سے اٹکا دینا، اس کے ساتھ لٹکا دینا، کہ جب ایک کا دھیان آئے، تو ساتھ ہی دوسری کا بھی آ جائے۔

واقعات کو جب حفظ کرنا منظور ہو، تو اس سلسلے میں امور ذیل ملحوظ رہیں :-

(۱) اہم واقعات و غیر اہم واقعات یا ایک ہی واقعے کے اہم اجزاء و غیر اہم اجزاء کے درمیان تفریق ضروری ھے۔ ایسا اگر نہ کیا گیا، تو کل کے یاد کرنے کا بار حافظے پر بہت زائد پڑ جائے گا۔ اصل کو اصل کی جگہ پر رکھنا چاہیے، اور فرع کو فرع کا درجہ دینا چاہیے۔

(۲) واقعات جتنے زیادہ مرتب و منظم صورت میں ہوں، اُسی قدر اُن کے یاد رکھنے میں آسانی ہوگی۔

(۳) تحفظ کے لیے ذہن کو کچھ وقت بھی درکار ہوتا ھے۔ بے تحاشا تلے اوپر چیزیں ٹھونستے جانا، حفظ میں معین نہیں، مخل ہوتا ھے۔

بچوں کی عمر کے لحاظ سے بھی نفسیین نے حافظے کے درجے اور مرتبے رکھے ہیں۔ حافظے کے شباب کا زمانہ لوگ کہتے ہیں کہ ۶ سال کی عمر سے ۹ سال کی عمر تک رہتا ھے۔ اس

وقت بہترین چیزیں اگر یاد کرادی جائیں، تو آگے چل کر بہت کام آئیں گی - اس کی ضرورت ہرگز نہیں کہ اس میں جو کچھ یاد کرایا جائے، بچہ اُسے پوری طرح سمجھ بھی لے - صرف اجمالی سمجھ اِس سن کے لیے کافی ھے - زیادہ عمر آنے پر وہ خود اُس کی باریکیاں اور لطائف پوری طرح سمجھ لے گا، البتہ اُس وقت حفظ کرنے کی اتنی قوت باقی نہ رہے گی -

اس سے قبل کا زمانہ، یعنی تین سال کی عمر تک کا، یاد کرانے کا زیادہ نہیں ھوتا، اس دور میں بچہ خود ھی بہت کچھ سیکھ لیتا، اور اتنا یاد کر لیتا ھے کہ آئندہ پھر کبھی نہ یاد کر سکے گا - حافظے کی سادہ اور ابتدائی صورت تو گویا پیدائش کے ساتھ ھی وجود میں آ جاتی ھے - اور جہاں سمجھ کو وقت کا احساس ھو گیا، یعنی حال اور ماضی کے درمیان وہ امتیاز کرنے لگا، پھر تو سمجھنا چاھیے کہ حافظہ پوری طرح وجود میں آ گیا ----- ماضی کا تو دار و مدار ھی حافظے پر ھے -

۱۰ سال سے ۱۶ سال تک کی عمر کا زمانہ عقلی قوتوں کی نمو و بیداری کا ھوتا ھے - اب بچہ تعقل و استدلال کا خوگر ھو جاتا اور ھر چیز کی وجہ اور لم تلاش کرنے لگتا ھے - اب وہ محض حفظ کرنا اور ازبر کرنا نہیں، بلکہ جاننا، پہچاننا، اور سمجھنا چاھتا ھے -

ذھن کے اندر معلومات جو داخل ھوتے ھیں (اور انھیں کے تحفظ کا تعلق حافظے سے ھے) وہ حواس ھی کے راستے سے آتے ھیں - اور حافظے کے سیاق میں اھم‌ترین حواس دو ھیں -

ایک باصرہ، دوسرے سامعہ - معلومات عموماً یا تو اصلاً بصری ہوں گے، یعنی حس باصرہ سے ماخوذ - اور یا سمعی ہوں گے، یعنی حس سامعہ سے ماخوذ - فطرت نے اکثر طبائع کو ایک ہی قسم کے حافظے کا زیادہ عادی رکھا ہے - کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جنھیں آنکھوں سے دیکھی ہوئی ہی چیزیں زیادہ یاد رہ جاتی ہیں - اور بعض اس قسم کے ہوتے ہیں، جن کے دماغوں پر کانوں سے سنی ہوئی باتیں ہی زیادہ گہرا نقش چھوڑ جاتی ہیں - کوئی کوئی ایسے بھی نکلتے ہیں، جن کے حافظے بصری اور سمعی دونوں طرح کے یکساں ہوتے ہیں —— اچھے استاد کو چاہیے کہ بچوں کو پڑھاتے ہوئے حتی الامکان دونوں قسم کی قوت حفظ کو مخاطب رکھے - اپنی گفتگو سے، کانوں کے ذریعے سے بھی ان کے دل پر وہی نقش اُتارے جو حروف و الفاظ کے واسطے سے، بصری حیثیت سے منقوش ہو رہے ہیں -

حافظے کا تعلق انسان کے مختلف جذبات کے ساتھ مختلف قسم کا ہے - جذبات مسرت کی یاد اگر ماضی قریب سے متعلق ہے جب تو مسرت و نشاط ہی پیدا کرتی رہتی ہے، لیکن اگر اتنی مدت گزر چکی ہے، کہ اب اس کا شمار ماضی بعید میں ہے، تو جذبات مسرت کی یاد، بجائے مسرت کے اب حسرت پیدا کرے گی - یاد اگر جذبۂ غم سے متعلق ہے، تو غم جب تک تازہ ہے، اُس کی یاد بھی غم انگیز ہی رہے گی، بلکہ تازگی کے زمانے پھر اس یاد غم کو "یاد" غم کہنا ہی پوری طرح صحیح نہ ہوگا - یاد کرنا تو اُس وقت کہتے ہیں، جب وہ

کیفیت ذہن سے نکل جا چکی ہو اور اب دوبارہ آئی ہو۔ لیکن غم اگر واقعی پرانا ہو چکا ہے۔ اور بجائے حال کے ماضی بن چکا ہے، تو اب اس کے یاد کرنے میں ایک طرح کی لذت محسوس ہو گی۔ لذت کا عنصر غم میں ہمیشہ ہی موجود رہتا ہے۔ البتہ تازہ غم میں یہ عنصر خفی ہوتا ہے۔ باسی ہو جانے کے بعد یہی خفی عنصر نمایاں ہو جاتا ہے۔ غیظ و غضب، غصہ و ناگواری پیدا کرنے والے واقعات کی یاد البتہ دل میں پھر انھیں جذبات کو تازہ کردیتی ہے، اور جس شخص نے ظلم کیا یا ستایا ہے، اُس کی طرف سے ناگواری پھر بھڑکا دیتی ہے۔ بجز اس صورت کے کہ اب خود ناگواری ہی کا خاتمہ ہو چکا ہو، اور اس 'ظالم' کے ظلم ہی کے ہم قائل نہ رہے ہوں —— ماضی کا احساس تمامتر قوت حافظہ ہی کی بنا پر ہے۔ اگر حافظہ نہ ہوتا، تو ماضی کے کوئی معنی ہی نہ رہتے۔

کسی واقعے کے ایجابی وقوع یا مثبت پہلو کے یاد آ جانے کے معنی صرف یہ ہیں کہ اُس واقعے کی تصویر کے ساتھ ساتھ اُس کا زمان وقوع اور مکان وقوع بھی ذہن میں تازہ ہو گئے۔ کل ہم نے گھڑی میں کوک دی تھی، جب یہ واقعہ ہم یاد کرتے ہیں تو اپنے کو گھڑی کوکتے پانے کے ساتھ یہ نقش بھی ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں کہ فلاں وقت تھا اور ہم فلاں جگہ فلاں حالت میں تھے۔ یہ سارے نقش توافق و تطابق کے ساتھ ذہن میں آ جاتے ہیں۔ لیکن اب فرض کیجیے؟ کہ ہم کو کل گھڑی کا نہ کوکنا یاد آیا، تو واقعے کے عدم وقوع

یعنی اس کے سلبی پہلو کی یاد کی صورت یہ ہوتی ہے، کہ نفس واقعہ کی تصویر تو بدستور ذہن میں آتی ہے، لیکن اس کے جو لوازم زمانی و مکانی ہیں، وہ اُس کے ساتھ جوڑ نہیں کھاتے اور واقعے کے ساتھ ساتھ ذہن میں نہیں آتے ——— مثال میں گھڑی کی کوک کے ساتھ یہ تصویر ذہن میں ازخود نہیں آ جاتی، کہ کوک ہم فلاں جگہ اور فلاں وقت دے رہے تھے - اور یہی معنی ہیں یاد نہ پڑنے کے -

———

واقعات کے استحضار میں یہ تین امر خاص طور پر معین ہوتے ہیں :-

(۱) تازگی - جو واقعہ جتنا زیادہ تازہ اور حال کا ہو گا، اُسی نسبت سے وہ جلد اور بہ آسانی مستحضر ہو جائے گا - عام قاعدہ یہی ہے - بشرطیکہ کوئی امر اس کے معارض نہ پیش آ جائے -

(۲) توجہ - جو واقعہ جتنی زیادہ توجہ سے دیکھا یا سنا گیا ہے، اُسی نسبت سے اُس کے استحضار میں آسانی رہے گی -

(۳) تکرار - تیسرا اہم عنصر، استحضار میں واقعے کا اعادہ یا تکرار ہے - حافظے میں ہر نقش جتنا تازہ، جتنا گہرا، اور جتنا زیادہ دہرایا ہوا ہوگا، اُسی نسبت سے وہ مستحضر بھی ہو جایا کرے گا -

لیکن تحفظ و استحضار دونوں کی کتنی ہی کوششیں کی جائیں، بہر حال بھولتے رہنا، اور بھول چوک کا واقع ہوتے رہنا ایک امر طبعی ہے - اور یہ عام و طبعی نسیانی کیفیت

انسان کے حق میں ہر حال میں مصیبت و عذاب نہیں، عموماً
رحمت ہی ہے - خارج کے جو نقش ہر وقت ذہن میں بیٹھتے
رہتے ہیں، اگر کچھ دیر کے بعد اُن کے غیرضروری اجزاء ازخود
نہ حذف ہو جایا کریں بلکہ، سب کے سب برابر چمٹے رہیں،
یعنی ہم جب کبھی کسی جزئی واقعہ کو یاد کریں، تو وہ واقعہ
ذہن میں سارے زمانی، مکانی، حسی متلازمات کے ساتھ آئے،
تو جان غضب میں پڑ جائے، اور زندگی وبال بن جائے - اس
لیے قدرت نے اپنی طرف سے یہ انتظام رکھا ہے کہ جتنے غیر
ضروری متلازمات ہوتے ہیں، وہ خود ہی حافظے سے محو ہو
جاتے ہیں -

عمر کی زیادتی اور صحت کے زوال کے ساتھ ساتھ عام
ضعف دماغی پیدا ہو جانا اور اُس سے قوت حفظ کا بھی متاثر
ہونا امر طبعی ہے - صحت کی حالت میں ماہرین فن کو
تجربوں سے معلوم ہوا ہے کہ یاد کی ہوئی چیزوں میں سے جتنا
حصہ بھولنے والا ہے، اُس کا آدھا تو شروع ہی کے آدھ گھنٹے
میں بھول جاتا ہے - اور رفتہ رفتہ ایک مہینے کے آخر میں
۴/۵ حصہ ذہن سے نکل جاتا ہے - یہ بھی تجربے سے ثابت ہوا ہے
کہ جب کبرسنی یا ضعف دماغ کے باعث نسیان مرض کی صورت
اختیار کر لیتا ہے، اور انسان بہت زیادہ باتیں بھولنے لگتا
ہے، تو نسیان ناموں سے شروع ہوتا ہے - سب سے پہلے نام ہی
حافظے سے رخصت ہوتے ہیں، صورتیں اکثر دیر تک یاد رہ
جاتی ہیں ——— "اجی، کیا نام ہے اُن کا" - "دیکھیے،

بھولا سا نام ہے، اِس وقت بھولا جاتا ہوں"۔ اس طرح کے فقرے جو بارہا سننے میں آئے ہوں گے، اسی کیفیت کے مظہر ہیں۔

ماہرین نے ایک کلیہ یہ لکھا ہے کہ جو چیزیں حافظے میں جتنی زیادہ مرتب صورت میں ہوتی ہیں، وہی سب سے آخر تک ساتھ دیتی ہیں، اور مرتب کے معنی یہ ہیں کہ ان کی وابستگیاں (Associations) ذہن میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہوں۔ تو گویا قاعدہ یہ ہاتھ آیا کہ جو چیز ذہن کے اندر جتنی زیادہ وابستگیوں کے ساتھ ہوگی، اُسی قدر اُس کا نقش پائدار اور دیرپا ثابت ہوگا —— مسلم یونیورسٹی کے ایک وائس چانسلر اور علیگڈھ کے مشہور قومی کارکن صاحبزادہ آفتاب احمد خان جب آخر عمر میں فالج میں مبتلا ہوئے، تو رفتہ رفتہ ہر چیز بھول گئے۔ کھانے پینے اور روزمرہ کی ضروریات زندگی کی چیزوں میں سے کسی کا نام یاد نہ رہا، صرف قرآن شریف کی ایک آدھ چھوٹی سورۃ جو بچپن میں یاد کرادی گئی تھی، بس اُسی کا نقش ذہن پر قائم رہا، وہی یاد رہ گئی۔

حافظے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر اسے کسی اور فوری مقصد کے لیے استعمال کیا جائے، تو یہ بھی بس اُسی حد تک ساتھ دیتا ہے، اور اس مقصد کے حاصل ہو جانے کے بعد گویا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ وقت امتحان کے قریب طالب علم جن مضامین کو محض امتحان ہی کی ضرورت سے، بغیر اصلی شوق کے محض رٹ رٹا کر ازبر کر لینا چاہتے ہیں،

تو عموماً یہی ہوتا ہے کہ امتحان کے بعد ہی اُن کے نقش ذہن سے نکل جاتے ہیں، اور طالب علم کورے کا کورا رہ جاتا ہے۔ استعداد میں اضافہ نہیں ہوتا ——— معدے کا سا حال ہے۔ جو کھانا، بغیر اچھی طرح چبائے اور اطمینان سے کھائے ہوئے، محض جلدی جلدی نگل لیا جاتا، اور کسی طرح حلق کے اندر ٹھونس لیا جاتا ہے، وہ جزو بدن نہیں ہوتا، نکل ہی جاتا ہے۔

نواں باب

توجہ

کوئی صاحب کمرے کے اندر سر شام بیٹھے ہوئے ہیں - فرش پر کوئی کالی کالی سی چیز ہلتی رینگتی نظر آئی - اندھیرا ہے، خوب صاف دکھائی نہیں دیتی - یہ قریب آ کر بہ غور دیکھنے لگے - معلوم ہوا ایک کیڑا ہے ـــــــ یہ غور سے دیکھنا عمل توجہ کہلاتا ہے -

ہم کمرے میں بیٹھے کتاب پڑھ رہے ہیں کہ دور سے کچھ گھنگھناہٹ کچھ سرسراہٹ معلوم ہوئی - خوب صاف پتا نہیں چلتا کہ کس چیز کی آواز ہے - کتاب سے نظر ہٹا، آواز پر ہم نے کان لگائے اب معلوم ہوا کہ کوئی موٹر قریب سے گذر رہا ہے - آواز اسی کی تھی ـــــــ یہ کان لگا کر سننا توجہ کے ساتھ سننا تھا -

---

ماسٹر درجے میں سبق پڑھا رہے ہیں - ایک کونے سے کھسر پھسر کی آواز آنے لگی - ماسٹر سبق روک، ادھر دیکھنے اور اس اواز کو سننے لگے - پتا چل گیا کہ فلاں فلاں لڑکے باتیں کر رہے ہیں ـــــــ لڑکوں کی آواز ظاہر ہے کہ اب بھی اتنی ہی رہی، اس میں تو کچھ فرق ہوا نہیں، فرق یہ البتہ ہوا کہ ماسٹر نے اب ادھر توجہ کی -

آپ ایک پرجوش لکچرار کی تقریر سن رہے ہیں -
اس کا لفظ لفظ آپ کے دل میں اُترتا جا رہا ہے اتنے میں آپ
کو گھر جانے کی ایک بڑی ضرورت یاد پڑ گئی - آپ نے اُٹھنے
کا ارادہ کیا - اور کچھ دیر اِس ارادے کے قائم کرنے اور پھر
اس پر عمل کرنے میں لگی - اس چند سکنڈ یا منٹ کی مدت میں
اس نے جو کچھ کہا وہ آپ کے لیے بالکل اَن سنا رہا ——
لکچرار کی حالت ظاہر ہے کہ جوں کی توں رہی - آپ ہی
میں اتنا فرق ہوا کہ اتنی دیر آپ اُدھر سے بے توجہ رہے -

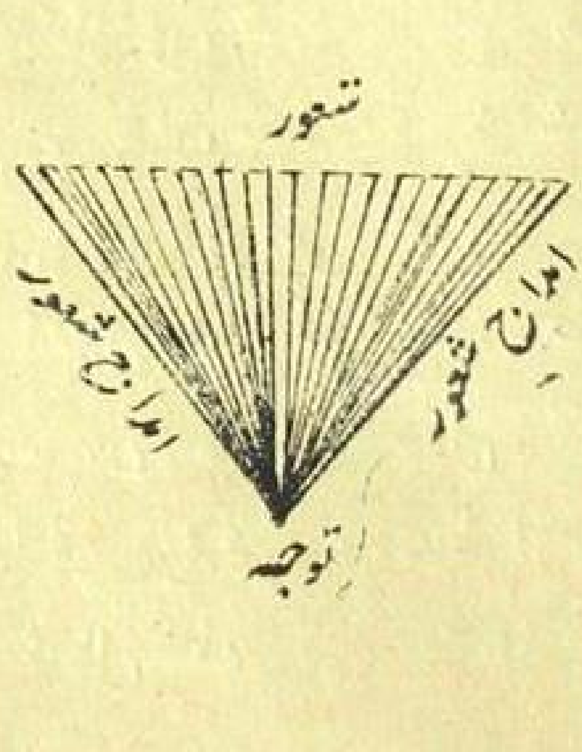
روزمرہ کی ان مثالوں نے یہ نفسیاتی حقیقت ظاہر کی
ہی کہ توجہ نام ہے شعور میں مرکزیت پیدا کرنے کا یا شعور
کے متفرق خطوط یا شعاعوں کو کسی ایک نقطے پر لاکر جمع
کر دینے کا - شعور جب تک اپنا کوئی مرکز نہیں بناتا ایک
انتشاری اور پراگندہ حالت میں ہے - انسان خالی الذہن
کہلاتا ہے - اُدھر اس کی یہ قوت کسی خاص نقطے پر جمع
ہوئی - اُدھر وہ متوجہ کہلانے لگا -

لالٹین، لمپ، بجلی کا قمقمہ، روشنی کوئی سی بھی ہو،
جب تک اس کی شعاعیں متفرق اور پھیلی ہوئی ہیں، روشنی
ہلکی اور دھیمی رہے گی - لیکن اِدھر وہی شعاعیں کسی ایک
نقطے پر سمٹ، سمٹا کر اکٹھا کردی گئیں اُدھر وہی روشنی
تیز سے تیزتر ہوجاتی اور کیسی چمک اٹھتی ہے ! یہی حال
توجہ کا ہے - توجہ، شعور کا کوئی مخصوص و مستقل صیغہ نہیں،
صرف اس کی مرکزیت کا نام ہے - توجہ کے بغیر شعور کا سالن

بے نمک ہے - آب و نمک اسی توجہ سے پیدا ہوتا ہے - بغیر توجہ کے ہر شعوری عمل ادھورا اور ناتمام رہتا ہے - تکمیل کو اُسی وقت پہنچتا ہے جب اس کی بھی آمیزش ہو ———
ارادے اُسی وقت پختہ ہوتے ہیں جب اُن پر توجہ کی جائے - جذبات اُسی وقت اپنے شباب پر پہنچتے ہیں جب اُن کی طرف متوجہ رہا جائے - سائنس اور آرٹ علم و فن، صنعت و تجارت - ان میں سے ہر شے کامیاب اور نتیجہ خیز ہونے کے لیے توجہ کی محتاج ہے -

توجہ کی تعریف یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ جس عمل سے شعور کی موجیں کسی ایک خاص رخ میں لائی جائیں وہی عمل توجہ ہے - اور یہ بھی ایک لطیفہ ہے کہ عربی، فارسی اردو میں توجہ کے لفظی معنی بھی یہی ہیں - توجہ اے رو بہ چیزے آوردن -

شعور و توجہ کے تعلق باہمی کا کوئی نقشہ دیکھنا چاہے، تو ذیل کی شکل ملاحظہ ہو -



تجربے میں توجہ کی دو مختلف صورتیں برابر آتی رہتی ہیں - ایک تو یہ کہ خارج سے کوئی محرک قوی پیش آیا - اور اس نے خود بخود بغیر ہمارے کسی قصد و ارادے کے ہم کو اپنی طرف متوجہ کر

لیا - بادل دفعتاً زور سے گرجا اور ہر شخص خود بہ خود چونک پڑا - بجلی یک بہ یک زور سے چمکی اور ہماری آنکھیں آپ ہی آپ جھپک اُٹھیں - یہ صورتیں توجہ اضطراری یا توجہ طبعی کی ہوئیں -

دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اپنے قصد اور کوشش سے اپنے کو کسی جانب متوجہ کریں - ریاضی کا سوال اُستاد نے دیا - اور ہم نے بہ کوشش اپنے کو اس کے حل پر آمادہ کیا - کالج کا گھنٹا بجا اور ہم دوسرے کاروبار چھوڑ بالقصد درجے میں داخل ہوئے - یہ مثالیں توجہ ارادی یا توجہ عقلی کی ہوئیں ——— ایک نیا قانون یہاں سے یہ ہاتھ آیا کہ توجہ اضطراری میں نفس معمول و متاثر ہوتا ہے اور اس کی حیثیت انفعالی رہتی ہے - اور توجہ ارادی میں نفس عامل و موثر ہوتا ہے اور اس کی حیثیت فاعلی رہتی ہے -

توجہ اضطراری اور توجہ ارادی الگ الگ چیزیں ہیں - لیکن ایک دوسرے کی ضد یا نقیض نہیں - بلکہ اکثر تو اعمال نفسی میں شریک و مخلوط رہتی ہیں ——— درجے میں کاپیوں کی اصلاح ہو رہی ہے - لڑکے استاد کو گھیرے کھڑے ہیں - ایک کو شرارت جو سوجھی تو اپنی کتابیں تڑاتڑ زمین پر گرانی شروع کر دیں - استاد کی جھکی ہوئی گردن معاً اٹھی' اور نگاہ ہر طرف دوڑنے لگی کہ کس کی حرکت ہے - اس مرکب عمل کا پہلا جز یعنی گردن کا بے ساختہ اُٹھ جانا تو ہوا توجہ اضطراری کے ماتحت کہ اس میں قصد و ارادے کا دخل نہ تھا - رہا جز دوم یعنی نگاہ پھیر کر شریر لڑکے

کی تلاش، یہ توجہ ارادی کا نتیجہ تھا۔ کہ یہ قصد و ارادے کے ماتحت صادر ہوا۔

توجہ اضطراری ایک عام اور طبعی شے ہے۔ ہر حیات نفسی رکھنے والی مخلوق اس کی حصہ دار ہوتی ہے۔ گنوار، جاہل، بچہ، سب یہاں تک کہ جانور بھی۔ البتہ جس شے کا نام توجہ ارادی یا عقلی ہے۔ وہ سن و تربیت کی محتاج ہوتی ہے۔ اور اس لیے چھوٹے بچے اور بن مانس قسم کے وحشی اور جنگلی انسان بڑی حد تک اس سے محروم ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے یوں بھی درست ہے کہ توجہ اضطراری کو توجہ وہبی سے موسوم کریں اور توجہ ارادی کو توجہ اکتسابی سے۔

اب ایک نظر اس پر بھی کر لی جائے کہ توجہ اضطراری رکنی اور بڑھتی کن کن حالات و اسباب کے ماتحت ہے۔

(۱) پہلی چیز دماغ کی تازگی ہے۔ چھوٹے بچوں کو دیکھیے، صبح سویرے کیسے چست جان، ہشاش بشاش نظر آتے ہیں۔ اور شام کو خستہ اور ماندہ ہو جاتے ہیں۔ صبح ہر چیز میں خواہ مخواہ دلچسپی لیتے ہیں شام کو آنکھیں ملتے ہوئے سونے کے لیے ضد کرنے لگتے ہیں۔

توجہ کسی قسم کی بھی ہو۔ اس کے وجود میں لانے اور قائم رکھنے کی بڑی شرط یہ ہے کہ دماغ اور نظام عصبی میں قوت کا کافی ذخیرہ موجود ہو۔ عام بول چال میں اس سرمایۂ قوت کو تازگی دماغ اور بشاشت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس میں یہ ذخیرۂ قوت فطرتاً جتنا زیادہ ہوتا ہے۔ اسی قدر

وہ توجہ کو بھی عرصے تک قائم رکھ سکتا ھے۔ ایک ھی فرد میں جن اوقات میں یہ ذخیرہ زیادہ ھوتا ھے۔ اُسی نسبت سے وہ دیر تک توجہ قائم رکھ سکتا ھے۔ اور جس نسبت سے خستگی و کسل کے باعث یہ ذخیرہ گھٹتا جائے گا' اُسی شرح سے قوت توجہ میں بھی کمی آتی جائے گی۔

(۲) دوسری چیز محرک یا مہیج کی قوت ھے۔ بادل کی پرزور گرج۔ ریل کی سخت گھڑگھڑاھٹ' بم کے شدید دھماکے سے ھر شخص چونک پڑتا ھے۔ لمپ کی تیز تڑپ' بجلی کی چمک سے آنکھ سب کی جھپک جاتی ھے' بو یا خوشبو اگر بہت تیز ھے۔ تو ممکن نہیں کہ شامہ متاثر نہ ھو' معلوم یہ ھوا کہ تحریک یا مہیج جتنا قوی یا شدید ھو گا۔ اُسی نسبت سے اس میں جذب توجہ کی قوت زیادہ ھو گی۔

(۳) تیسری شرط محرک یا مہیج کا تنوع ھے۔ چھوٹا بچہ اندھیرے میں لیٹا پڑا رو رھا ھے کوئی روشنی لے کر آ گیا۔ اور بچہ معاً چپ ھو جاتا ھے۔ جدید مہیج نے بچے کی توجہ اپنی طرف کرلی اور وہ بہل گیا۔ ایک مہیج کے دیر تک قائم رھنے سے طبیعت اس کی طرف سے اُچاٹ ھو جاتی ھے۔ قیام توجہ کے لیے ضروری ھے کہ مہیج بدلتا رھے ——— "کل جدید لذیذ" کا اصول اپنی حقیقت کا ترجمان ھے۔

تھیٹر میں' سنیما میں غم و سرور کے سین جو جلدی جلدی ادلتے بدلتے رھتے ھیں اس کی وجہ بھی یہی ھے کہ طبیعت ایک ھی منظر سے کہیں اکتا نہ جائے۔

(۴) چوتھے نمبر پر خود مہیج کی نوعیت کو بھی اس

میں بڑا دخل ہوتا ہے - بچے کو جو التفات اپنی ماں کے ساتھ ہوتا ہے - کسی اور کے ساتھ نہیں ہوتا - انسان کو جو کشش اپنے وطن کے ساتھ ہوتی ہے کسی اور مقام سے نہیں ہوتی - ہر فرد بشر کے لیے بعض خاص مہیج دوسرے مہیجات کے مقابلے میں کشش اور دل آویزی زیادہ رکھتے ہیں - اور ہر فرد کے قیام توجہ کے لیے ضرور ہے کہ اس کی مخصوص دل کشی کے مہیجات اس کے سامنے آئیں -

اب یہاں پہنچ کر سوال یہ پیدا ہو گا کہ خود دلکشی کا کیا مفہوم ہے ؟

لکھنؤ میں باہر کے سیاح کتنے آیا کرتے ہیں - لیکن واپسی پر کھوج لگائیے' تو ہر شخص کے حافظے پر نقوش و تاثرات الگ الگ پائیے گا - کوئی صاحب صرف مشہور عمارتوں کی آنکھ سے پیمائش کر کے چلے جاتے ہیں - دوسرے صاحب اپنا وقت تفریح گاہوں' اور عشرت خانوں کی نذر کر دیتے ہیں - تیسرے بزرگ شہر کے نامور طبیبوں اور ڈاکٹروں کی خدمت میں حاضری دیتے ہیں - چوتھے صرف کتب خانوں کی سیر اور اہل علم سے ملنے ملانے میں رہتے ہیں - و قس علیٰ ہذا - غرض گو لکھنؤ شہر سب دیکھتے ہیں لیکن ہر ایک کا لکھنؤ دوسرے کے لکھنؤ سے الگ ہوتا ہے ——— ایک روزنامہ ایک ہی وقت میں ہزاروں ہاتھوں میں پہنچتا ہے - لیکن ذرا دیکھیے گا ہر دیکھنے والے کی نظر اور نقطۂ نظر دوسرے سے کتنا مختلف ہوتا ہے - کوئی صاحب صرف اشتہارات پڑھتے ہیں اور وہ بس اپنے مطلب کے - کوئی محض جنگ کے

تار پڑھتا ھے اور باقی سب خرافات سمجھ کر چھوڑ دیتا ھے - کوئی صرف صوبے اور شہر کی خبروں کے کالم پر آنکھیں گڑی رکھتا ھے - کوئی ایڈیٹوریل صفحہ ھی پڑھ پڑھ کر جھومتا ھے - اور کوئی بغیر کسی فرق و تفریق کے اول سے آخر تک ایک ایک سطر پڑھ جاتا ھے - ——— یہی حال دنیا کی ھر شے کا ھے - جتنی آنکھیں اتنے ھی منظر -

بات یہ ھے کہ ھمارے دل میں مدرکات کا ایک انبوہ بے پایاں ھر وقت رھتا ھے - لیکن ھمارے علم و ادراک میں اُن کا صرف ایک بہت ھی محدود و مختصر حصہ پایا جاتا ھے - روزانہ ھزارھا ھوائی موجیں ھمارے کانوں سے ٹکراتی ھیں، لیکن ھمارے لیے غیر مسموع رھتی ھیں - رنگ و جسامت کی بے شمار تجلیاں آنکھ کے سامنے کوندتی رھتی ھیں لیکن ھمارے لیے غیر مرئی رھتی ھیں - علم و شعور میں اس وسیع اور ناپیدا کنار کائنات کی صرف وھی چیزیں آتی ھیں، جن سے نفس مدرک کو کوئی تعلق یا ذوق ھوتا ھے - اور باقی حدود علم و شعور سے خارج رھتی ھیں - ھر شخص اپنے ماحول سے بس وھی چیزیں چن لیتا ھے، جن سے وہ ذوق و تعلق رکھتا ھے - اور باقی موجودات کو وہ اس طرح چھوڑ دیتا ھے، کہ گویا وہ اس کے لیے معدوم کا حکم رکھتی ھیں - یہی راز ھے اس کا کہ ھر شخص کا دائرۂ معلومات دوسرے سے مختلف ھوتا ھے - اور جو چیز عیاں اور معروف ھوتی ھے وہ دوسرے کے لیے مخفی و مجہول کے حکم میں ھوتی ھے -

غرض دلکشی سے مراد تو وھی ھے - جو اس کے لفظی

معنی سے ظاہر ہو رہی ہے، یعنی کسی شے سے دل کو لگاؤ ہو، اور دل اس جانب ازخود کھنچے ۔ لیکن نفسیات کے طالب علم کو جو کرید رہا کرتی ہے، اس کے لحاظ سے اُس نے تحلیل کر کے حسب ذیل اجزاء بھی اس کے دریافت کر لیے ہیں :-

(۱) ندرت :- دل‌کشی کا بڑا زبردست عنصر جدت یا ندرت ہے ۔ وہی مرغوب غذا اگر روز کھاتے رہیے تو نا مرغوب ہو جائے گی ۔ مزیدار کہانی بار بار سنئے سنئے پھیکی اور بے مزہ معلوم ہونے لگتی ہے ۔ کسی شے کے پامال و فرسودہ ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اب اس میں لطف و دل‌آویزی باقی نہیں رہی ——— دل‌کشی کا تجزیہ اگر منظور ہے تو لازمی ہے کہ اپنی پرانی چیز میں نئے نئے پہلو ندرت کے نکالے اور تراشے جاتے رہیں ۔

(۲) مانوسیت :- ندرت اور طرفگی اجنبیت و غرابت کے مرادف نہیں ۔ جو مزہ ایک مانوس و مالوف شے میں آتا ہے وہ کسی اجنبی اور انوکھی شے میں نہیں ملتا ۔ کسی جاہل گنوار کے سامنے غالب کا شعر پڑھ کر دیکھیے ۔ اُسے زرا لطف نہ آئے گا ۔ پانچ برس کے بچے کے آگے لیلیٰ مجنوں کا قصہ دہرائیے ۔ زرا نہ سمجھے گا ۔ جو دماغ شعر و شاعری سے مانوس نہیں، اُن کے لیے بہتر سے بہتر کلام بھی غیر مفہوم ہے ——— نا مانوسیت اور اجنبیت ذہن کے لیے سامان وحشت ہیں ۔

(۳) جذبہ انگیزی :- بچوں کو دیکھیے اپنے کھیل میں پورے انہماک کے ساتھ لگے ہوئے ہیں ۔ دوران گفتگو میں ادھر

کسی سے اپنا نام سنا اُدھر سر اٹھاکر دیکھنے لگے ۔ مصنف اخبار پڑھتا ہوتا ہے، اتفاق سے دوسرے صفحے کے کالم پر خود اپنے یا اپنی کتاب کے نام کی جھلک نظر آ گئی اور نظریں اُچٹ کر وہیں پہنچ گئیں ———— مہیج دلکش وہی ہوتا ہے جس سے ہماری ذات یا صفات سے تعلق کسی جذبے کو براہ راست یا بالواسطہ تحریک ہو، ایسا کوئی موضوع ہمارے لیے دلچسپی نہیں رکھ سکتا، جس سے تعلق نہ ہماری ذات کو ہو اور نہ ہمارے عزیزوں اور دوستوں کو، نہ ہمارے ملک و ملت کو، اور نہ ہمارے مشغلوں اور مقصدوں سے کوئی ربط و مناسبت رکھتا ہو۔

یہ ضرور نہیں کہ جس جذبے کو تحریک ہو رہی ہو وہ خوش گوار ہی قسم کا ہو۔ جس طرح اپنے بچوں کی شادی بیاہ یا اونچی ملازمت پا جانے یا امتحان پاس ہونے کے تذکرے میں ہمارا جی لگتا ہے، اُسی طرح کسی عزیز قریب کی بیماری یا موت کا تذکرہ بھی چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا ۔ خوش گوار جذبات کی خوش‌گواری تو ظاہر ہے ۔ درد انگیز جذبات میں بھی درد لذیذ قسم کا محسوس ہوتا ہے ۔

(۴) تضاد و تقابل :- سفید براق کپڑے پر سیاہ دھبا، نستعلیق کتابت کے اندر خط نسخ کی عبارت، سنجیدہ تقریر کے اندر ظریفانہ فقرے، پردیس میں کسی ہموطن کی جھلک، بے تکلف دوستوں کے مجمع میں کسی اجنبی کی شکل، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان پر نظر اور ذہن کی نظر فوراً اور یقیناً جم جاتی ہے ۔

(٥) اعجوبگی :- یه ندرت و جدت سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن اُن سے الگ ایک مستقل کیفیت ہے۔

معمولی قابلیت کا استاد پہلے اصل مسئلہ بیان کرتا ہے۔ پھر مختلف مثالوں سے اس کی تشریح کرتا ہے۔ ہوشیار استاد یہ کرتا ہے کہ اس کا آغاز ہی مختلف، جزئی مثالوں سے کرتا ہے، اور آخر میں ان کی مدد سے طلبہ کو ایک جدید نتیجے تک پہنچاتا ہے۔ اخبار کے ہوشیار رپوٹر خبر کے عنوان میں "اعجوبگی" کا پورا لحاظ رکھ لیتے ہیں، اور خود خبر کے ابتدائی حصے کو زیادہ سے زیادہ عجوبہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ناول، اور ڈرامے کامیاب وہی ہوتے ہیں جن کا پلاٹ (خاکہ) ذرا پراسرار اور طلسمی قسم کا ہو، کہ شوق و اشتیاق آخر تک قائم رہے ـــــــ، جو شے بالکل عیاں و عریاں شکل میں نظر کے سامنے آ جاتی ہے اس کے لیے ذہن میں کوئی کرید اور جستجو نہیں پیدا ہوتی، بر خلاف اس کے جو شے اپنے اندر راز و سربستگی رکھتی ہے اس کے دریافت کرنے اور حل کر ڈالنے پر ذہن از خود مستعد ہو جاتا ہے۔ اور اس میں ایک خاص لذت پاتا ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی شے میں دلکشی کے یہ سب، یا ان میں سے کئی کئی اجزاء ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو اس مبحث کی دلکشی کئی گنی بڑھ جاتی ہے۔ تحریک خلافت و ترک موالات کے زمانے میں گاندھی جی یا مولانا محمد علی رح تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو خلقت کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے، اس لیے کہ دلکشی کے

کئی کئی عنصر ایک ساتھ اپنا عمل کرنے لگتے' آج یہی جادو مختلف طبقوں کے لیے کانگریس اور مسلم لیگ یا بعض اور سیاسی پارٹیوں کے نام میں ہے -

---

توجہ کی طرح دلکشی کی بھی صورتیں دو ہیں - ایک طبعی یا فطری' جیسے بچوں کو مٹھائی سے رغبت یا کھیل کا شوق' دوسرے عقلی یا اکتسابی' جیسے ڈاکٹر کا دل اعمال جراحی میں لگتا ہے - یا عالم و مصنف کو پڑھنا لکھنا لذیذ معلوم ہوتا ہے -

طبعی دلکشی انہیں چیزوں سے ہوتی ہے جو کسی درمیانی واسطے' غرض' یا مقصد کے بجاے طبیعت کو براہ راست یا از خود مرغوب و محبوب ہوتی ہیں - اکتسابی دلکشی کی چیزیں وہ ہیں جو کسی غرض' مقصود یا مقصد مطلوب کے واسطے سے رفتہ رفتہ خود بھی دلکش بن جاتی ہیں' کھیل' تماشے' مٹھائیاں' بچوں کے لیے ذاتی اور براہ‌راست کشش رکھتی ہیں - جس کے لیے وہ کوئی الگ سبب یا وجہ نہیں بیان کر سکتے - ڈاکٹر کو دلکشی عمل جراحی سے' یا مصنف کو تصنیف و تالیف سے اُن فوائد و ثمرات کے لحاظ سے ہوتی ہے' جو ان پر مرتب ہو جاتے ہیں -

بہت سی صورتوں میں کسی امر کی عادت و مزاولت ہی' بغیر کسی شعوری مقصد و مصلحت کے' جذبۂ عمل کے ساتھ اکتسابی دلکشی پیدا کر دیتی ہے -

اب یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ توجہ اضطراری

اور دلکشی کے درمیان فاصلہ اگر ہے تو چند قدم سے زائد نہیں - بعض لکھنے والوں نے توجہ اضطراری اور ارادی کے درمیان فرق یہ قرار دیا ہے کہ ایک دلکشی سے پیدا ہوتی ہے اور دوسری سعی و کوشش سے - گویا توجہ اضطراری کا ماخذ و مبنیٰ جذبات ہیں، اور توجہ ارادی کا ماخذ و منشا، ارادہ، لیکن ذرا اور گہرائی میں جائیے تو معلوم ہو گا کہ توجہ ارادی کا سبب قریب بیشک ارادہ ہی ہوتا ہے، لیکن اصلی منشاء و ماخذ اس کے بھی وہی جذبات ہیں - بالفعل اور فی الفور بیشک ارادہ ہی توجہ ارادی کو قائم رکھے ہوتا ہے، لیکن خود اس ارادے کی زندگی تو جذبات ہی کے سہارے قائم ہوتی ہے -

بچہ جب پڑھنے بٹھایا جاتا ہے - تو شروع شروع اس کا دل کتاب سے بھاگتا ہے - استاد اگر سمجھدار ہے، تو کبھی وہ حروف کو مٹھائی کی، کبھی تصویروں کی، کبھی گیلی مٹی کے آٹے کے کھلونوں کی شکل میں پیش کرتا ہے - اور قصہ زبانی بیان کرنا شروع کر دیتا ہے - بچے کا جی اُدھر لگنے لگتا ہے، اور وہ اُن کے متعلق سوالات کرنے لگتا ہے - سمجھدار استاد انھیں غیر متعلق چیزوں کو متعلق بنا دیتا ہے - اور انھیں کو سبق سے وابستہ کر دیتا ہے - ان بالواسطہ دلچسپیوں کو مختلف طریقوں سے برابر ترقی دیتا رہتا - اور ان سے بچے کی طبیعت کو پڑھنے لکھنے سے مانوس کرتا رہتا ہے - یہاں تک کہ کچھ عرصے میں عادت قائم ہو جاتی ہے، اور اب بچہ تعلیم پر توجہ عادت کی بنا پر کرنے لگتا ہے - گویا جو چیز پہلے بالکل بے لطف و بے مزہ تھی، وہی اب مختلف

جذبات کے واسطے پر لطف و دلکش بن گئی -

استاد اگر نافہم ہوا، تو وہ توجہ کی بنیاد دلکشی پر قائم نہ کر سکے گا - نتیجہ یہ ہوگا کہ طالب علم کو توجہ ارادی کی بھی عادت نہ پڑے گی - اور وہ ساری عمر تعلیم و تعلم سے جی چرائے پھرے گا -

یہی حال عموماً عبادتوں اور مذہبی ریاضتوں کا ہے - سردی میں وضو کرنا، گرمی میں روزہ رکھنا - رات دن میں بار بار نماز کے لیے کھڑے ہونا، شروع شروع مسلمان بچے کی طبیعت پر شاق گزرتا ہے - لیکن ثواب کا شوق، جنت اور جنت کی نعمتوں کی تمنا، اور سب سے بڑھ کر اپنے معبود و مالک کی رضا کا خیال رفتہ رفتہ ان سختیوں کو راحتوں میں تبدیل کر دیتا ہے - اور عادت و مزاولت کے بعد غم و مشقت کی چیز عبادت نہیں بلکہ ترک عبادت رہ جاتی ہے ——

ان مثالوں نے یہ حقیقت واضح کردی کہ توجہ ارادی بھی جذبات ہی کے ایک خاص سلیقے و نظم کے ساتھ مرتب کر دینے کا نام ہے - اور توجہ کی دو قسمیں بہ لحاظ اپنی اصل آخری اجزاے ترکیبی کے ایک ہی ہیں -

ایک فرنچ مصنف اپنے ملک کے ایک ۶ سال کے بچے کا حال بیان کرتا ہے کہ "بڑا بدشوق، اور پڑھنے لکھنے کے نام سے بھاگنے والا تھا - ایک روز خود بہ خود پیانو بجانا شروع کیا - جو گت بجائی وہ اس کی ماں کو بہت پسند آئی، کوئی گھنٹہ بھر تک بجاتا رہا - اور ماں برابر نہال ہوتی رہی، کچھ روز بعد اتفاقاً دیکھتی ہے کہ بچہ اپنے والد کی میز کے

سامنے بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے - وہ خوب جانتی تھی کہ صاحبزادے کو قلم چلانے سے کیا سروکار، حیرت سے پوچھا کہ آج یہ نئی بات کیسی؟ بچے نے جواب دیا کہ "کاغذ پر جرمن کہانی کی مشق کر رہا ہوں، جی تو ذرا نہیں لگتا لیکن اماں جان کیسا خوش ہوں گی" ——— یہ تصدیق ہوگئی اس بات کی کہ توجہ ارادی کے ماخذ جذبات ہی ہوتے ہیں - بچہ ظاہر ہے کہ توجہ ارادی سے کام لے رہا تھا - اس لیے کہ ماں کو خوش کرکے بالواسطہ اپنے کو بھی خوش کرے - چیلے اپنے گرو کو، مرید اپنے مرشد کو، خیرخواہ نوکر اپنے آقا کو، خوش کرنے کے لیے، اپنے ذوق طبعی کے خلاف کڑیاں اٹھاتے رہتے ہیں، وہ سب اِسی قانون کی نظیریں ہیں -

---

فرنچ پروفیسر ریبو نے توجہ ارادی کی ارتقا کی تین منزلیں قرار دی ہیں :-

(۱) استاد، شاگرد کی توجہ اضطراری کی مدت کو جذبات مفرد کی مدد سے تدریجاً بڑھاتا ہے - انعام کی طمع، اپنی خوشنودی کی چاٹ، سزا کا خوف، مختلف ترغیبی محرکات سے توجہ اضطراری کو برابر تقویت پہنچاتا رہتا ہے -

(۲) منزل دوم میں استاد اپنا مخاطب شاگرد کے بلند تر محرکات کو بناتا ہے - اس کے جذبات خودداری، فرض شناسی، بلند نظری، مسابقت وغیرہ کو اُبھارتا ہے - یہ دور وہ ہوتا ہے، جب توجہ ارادی پیدا ہو چکی ہوتی ہے - اور ضرورت صرف اس کی رہ جاتی ہے کہ اُسے قائم اور ثابت کردیا جائے -

(۳) تیسری منزل میں یہ مقصد عادت کے ذریعے پیدا ہو جاتا ہے۔

خیال دوڑا کر دیکھیے، دنیا میں کوئی شخص بھی اپنی جگہ پر اور اپنی حالت سے مطمئن و راضی نہ ملے گا۔ وکیل صاحب کہتے ہیں کہ مزے کی زندگی تو ڈاکٹروں کی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں ڈپٹی صاحب کے آگے ہمیں کون پوچھتا ہے۔ تاجر زمینداروں پر رشک کرتے ہیں۔ اور زمیندار آزاد پیشوں کو للچائی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن عام بے چینی اور بے اطمینانی کے باوجود یہ نہیں ہوتا کہ دنیا میں کوئی عام ہلڑ مچ جائے۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ چھین جھپٹ کرنے لگ جائیں۔ بلکہ دنیا کے کار و بار ایک خاص نظم کے ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ اور اپنے اپنے کام میں ہر ایک لگا پھنسا ہوا ہے —— اس امن عام کا سہرا بڑی حد تک عادت ہی کے سر ہے۔

غرض توجہ ارادی کے قیام و تحفظ کی ضامن آخر میں عادت ہی رہ جاتی ہے۔ اور ابتداء میں اس کی پیدائش جذبات کے ہاتھوں عمل میں آتی ہے —— وکیل کی ہزاروں کی آمدنی اگر اول دن سے ہونے لگے تو مقدمات کی تیاری میں اتنی محنت اور دردسر وہ کیوں برداشت کریں؟ تاجر کو اگر بیوپار میں ہاتھ لگاتے ہی پورا نفع حاصل ہونے لگے، تو کار و بار کی پیچیدگیوں کو وہ سلجھانے کی فکر ہی کیوں کریں؟ لڑکے کو اگر اسکول میں قدم رکھتے ہی گھڑاکھٹ ڈگریاں ملنی شروع ہوجائیں تو دماغ سوزی کی ضرورت ہی

کیوں پڑے؟ سرکاری ملازم اگر شروع ہی سے جاہ و مال کی چوٹی پر پہنچ جائیں، تو محکومیت کی ذلتوں، اور سختیوں کے جھیلنے ہی کی کیوں نوبت آئے - لہذا یہ قاعدہ ہاتھ آیا کہ دنیا میں جو کوئی بھی کسی شے پر اپنی توجہ ارادی صرف کرتا ہے وہ کسی توقع ہی کی بنا پر کرتا ہے، اور اس سے آخر میں مقصود کسی طبعی جذبہ کی تسکین ہوتی ہے -

ایک بچے کو حساب کا سوال لگانے کے لیے دیا گیا ہے - سوال اس کے لیے تمام‌تر خشک اور بےمزہ ہے لیکن وہ یہ بھی خوب سمجھے ہوئے ہے کہ چھٹی ملنا اسی سوال کے حل پر موقوف ہے - اب چھٹی کو وہ شعوری یا غیرشعوری طور پر منتہائے مقصود قرار دے کر سوال لگانے کا تعب گوارا کر لیتا ہے - اور سوال پر پوری توجہ صرف کرنے لگتا ہے - سوال لگانا نہ مقصود بالذات ہے - نہ محض سوال پر وہ توجہ جما سکتا ہے - لیکن جو مقصود پیش نظر ہے اس کے حاصل کرنے میں سوال ہی آلے یا واسطے کا کام دے سکتا ہے —— یہیں سے اس کلیے کی بنا پڑی کہ شغل موجود توجہ اضطراری میں مقصود بالذات ہوتا ہے اور توجہ ارادی میں کسی مقصد کے حصول کا آلہ یا ذریعہ -

توجہ‌ارادی بہ ظاہر ایک مدت تک قائم رہتی ہے - لیکن واقعہ یہ نہیں، واقعہ یہ ہے کہ ہر چند منٹ کے بعد طبیعت ہٹنے لگتی ہے - لیکن معاً اصل مقصد کا تخیل (بارہا غیر شعوری طور پر) پیش نظر ہو جاتا ہے اور اسی سے تازہ دم ہو کر، انسان ہر دفعہ از سر نو صرف توجہ کرنے

لگتا ہے - امتحان میں طالبہ جب پرچہ لے کر بیٹھے ہیں تو اس کیفیت کا تجربہ خاص طور پر ہوتا ہے - طبیعت ذرا ذرا دیر کے بعد اکتانے لگتی ہے - لیکن معاً یہ خیال بھی آ جاتا ہے کہ "ارے اسی کے اوپر تو پاس فیل ہونے کا دارو مدار ہے - " اور یہی خیال توجہ کو اُدھر جما دیتا ہے ــــــ اس لحاظ سے یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ توجہ ارادی گویا ایک زنجیر ہے جس کی ایک ایک کڑی اگر الگ الگ کر کے دیکھی جائے تو توجہ اضطراری ہی کی نظر آئے گی -

لیکن جس طرح یہ صحیح ہے کہ توجہ ارادی تحلیل ہو کر توجہ اضطراری پر ٹھہرتی ہے - اسی طرح یہ بھی ہے کہ توجہ ارادی ہی ایک عرصے کے بعد رفتہ رفتہ توجہ اضطراری بن جاتی ہے - جس چیز کا نام مشق و مزاولت ہے اُس سے بس یہی ہوتا ہے کہ پہلے جن اعمال پر کوشش و قصد سے صرف توجہ کی جاتی تھی وہ ایک کافی مدت کے بعد اضطراری یا نیم اضطراری طور پر سرزد ہونے لگتے ہیں - اور بلا قصد کوشش خود ہی جلب توجہ کرنے لگتے ہیں ــــــ نوآموز جب تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے تو ہر لمحہ بہ کوشش اپنی تقریر کو سنبھالے رہنا پڑتا ہے - اور اس کے لیے قبل تقریر بھی مشقت اٹھانی پڑتی ہے - کبھی تخلیے میں مشق کرتا ہے - اور کبھی تقریر کے وقت تحریری یادداشتیں ہاتھ میں لیے رہتا ہے - لیکن وہی نوآموز جب مشاق خطیب و مقرر بن جاتا ہے تو اب نہ پہلے سے کسی تیاری کی ضرورت ہے نہ ہاتھ میں نوٹ ہیں - اب وہ برجستہ ہر عنوان پر

بول سکتا ھے - خیالات کی ترتیب دینے اور موزوں الفاظ کی تلاش کے لیے علیحدہ وقت کی ضرورت نہیں - لفظ اور مضمون دونوں بغیر کسی سعی و اهتمام کے ازخود اس کے دائرۂ توجہ میں آتے جاتے ھیں - گو مہارت اور مشاقی ایک پل ھے جس پر ھو کر توجہ ارادی توجہ اضطراری سے ھم آغوش ھو جاتی ھے -

توجہ ارادی کے سلسلے میں اس کے خصوصیات ذیل یاد رکھنے کے قابل ھیں :-

(۱) ارادہ نفس کو کسی شے پر آمادہ کر سکتا ھے لیکن توجہ کو قائم نہیں رکھ سکتا، تاوقتیکہ وہ شے دلکش بھی نہ ھو -

ایک عالم کے گرد کم علم اور بےعلم معتقدین کا مجمع ھوتا ھے - عالم کبھی کبھی ان کے سامنے کوئی علمی دقیق مسئلہ شروع کر دیتا ھے - معتقدین چاھتے ھیں کہ ایک ایک لفظ سنتے اور سمجھتے جائیں - دل میں اتارتے جائیں لیکن موضوع ان کے دائرۂ ذوق سے باھر ٹھہرا، کچھ ھی دیر بعد طبیعت اُچاٹ ھو جاتی ھے - طلبہ اپنا خشک اور غیر دلچسپ سبق تیار کرنے کے ارادے سے بیٹھے ھیں - لیکن چند ھی لمحوں میں اُن کا خیال بٹ جاتا اور ادھر سے ھٹ جاتا ھے - کتاب اب بھی اُن کے سامنے کھلی ھوئی ھے - لفظ و عبارت سب انکھوں کے سامنے موجود ھے - لیکن مفہومی کیفیت دماغ سے غائب ھے ——— غرض توجہ ارادی کے قیام و ثبات کے لیے ذوق، دلکشی لازمی ھے - محض ارادہ کافی نہیں -

(۲) نوعیت ذوق و دلچسپی کی تعیین البتہ اکثر ارادہ ہی کرتا رہتا ہے۔

اشٹیشن کبھی ہم سفر کے ارادے سے جاتے ہیں، کبھی کسی دوست سے ملنے ملانے اور کبھی محض سیر و تفریح کے لیے، باغ کبھی ہم محض ہوا کھانے جاتے ہیں کبھی اس غرض سے کہ مالی سے کچھ پوچھ پاچھ کریں اور کبھی اس لیے کہ پھول پتی کا کچھ علم حاصل کریں۔ اسٹیشن وہی اور باغ ایک ہی، لیکن ان سے ہماری دلچسپیاں بدلتی گئیں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ، متعین وقت پر دلچسپی کی تعیین یہ عموماً (گو ہمیشہ نہیں) ارادہ ہی کرتا ہے —— باغ کائنات کے اندر ہر ہر شے اپنے میں بے شمار دلچسپیاں رکھتی ہے۔ اور ان کی تعیین عموماً ارادے ہی کا کام ہے۔

(۳) ارادہ توجہ اضطراری کی قوت پر غالب نہیں آسکتا۔ بجز استثنائی اور غیر معمولی صورتوں کے۔

چھ برس کا بچہ استاد کے پاس بیٹھا پڑھ رہا ہے۔ سامنے رہگزر سے بارات نکل رہی ہے بچہ بہت سدھا ہوا اور نستعلیق ہے لیکن ہو نہیں سکتا کہ نظر اٹھ نہ جائے۔ اور سامنے دیکھنے نہ لگے، استاد اگر بچوں کا فطرت شناس ہے تو اس موقع پر سرزنش و ملامت سے کام نہ لے گا۔ وہ جانتا ہے کہ اس سن میں کھیل تماشے کی جانب یہ بیساختہ التفات، توجہ اضطراری کا کرشمہ ہے۔ جس کے سامنے ارادہ بےبس ہے۔ ہاں اگر عاقل و بالغ ہو کر بھی اتنا ضبط نہ پیدا ہو تو گنجائش ملامت کی نکلے گی۔

سن کے ساتھ ساتھ علم و تعلیم بھی توجہ ارادی کو نشو و تکمیل تک پہنچاتی رہتی ہیں - اَن پڑھوں اور جاہلوں میں توجہ اضطراری کا قصہ کمتر اور توجہ ارادی کا بیشتر ہوتا ہے - اور پڑھے لکھوں میں اس کے بالکل برعکس - توجہ ارادی میں پورا انہماک اور یکسوئی آسان نہیں - ایک طویل مدت کی تربیت اور مشق و ریاضت ضروری ہے پھر بھی توجہ ارادی کے حدود ہیں میں کسی نہ کسی نقطے پر پہنچ کر اُسے بہر حال توجہ اضطراری سے مغلوب ہونا پڑے گا ------ فیثاغورث اور سقراط نیوٹن اور ہیگل کے لیے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ اُن کی کرسی کے نیچے کوئی دفعتاً پٹاخا چھوڑ دے اور معاً چونک نہ پڑیں - توجہ اضطراری کی حکومت ارادے کی قلمرو سے باہر ہے -

توجہ اضطراری و ارادی دونوں کا بیان بقدر ضرورت ہو چکا - بہتر ہو گا کہ دونوں کے امتیازات خصوصی پر یکجائی نظر کر لی جائے :-

علت قریب	(توجہ اضطراری کی)	جذبات	(توجہ ارادی کی)	ارادہ
حالت شعوری	,,	انفعالی	,,	فاعلی
تحریک یا مہیج	,,	خارجی	,,	داخلی
مدت	,,	مختصر اور آنی	,,	طویل اور ممتد
[illegible]	,,	ذوق اور دلکشی	,,	سعی و اہتمام

مشاہدہ ہے کہ بعض اہل کمال کے مشغلے متعدد و کثیر ہوتے ہیں - وہ ایک ہی وقت میں متعدد اور مختلف نوعیت

کے شغل رکھتے ہیں - اور سب کو یکساں ذوق و شوق سے انجام دیتے رہتے ہیں - اس کے برعکس بعض ماہرین و کاملین ایسے ہوتے ہیں جو ایک وقت میں صرف ایک ہی چیز کو لے سکتے ہیں - ان کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت محدود اور مختصر ہوتا ہے - وہ ایک سے زائد چیزوں پر توجہ صرف نہیں کر سکتے - البتہ جس چیز کو بھی ہاتھ لگاتے ہیں' بس اُسی میں غرق ہو جاتے ہیں - گویا اُسی کے ہو رہتے ہیں —— تاریخ رجال مشاہیر فن کے اس دماغی فرق کی مثالوں سے لبریز ہے - نپولین ایک ہی وقت میں کئی کئی اہم سے اہم کام بے تکلف انجام دیتا رہتا تھا - سرسید احمد خاں تفسیر قران بھی لکھتے جاتے تھے - کالج کی عمارتیں بھی بنواتے جاتے تھے - کانفرنسیں اور جلسے کرتے - کالج اور بورڈنگ کی دیکھ بھال جانچ پڑتال اپنے ذمے رکھتے - چندے کے لیے دورہ کرتے رہتے - مسز بیسنٹ ایک ہی وقت میں تھیاسوفسٹ گروہ کی روحانی رہنمائی کرتیں - فلسفے پر کتابیں لکھتیں - ملک کی سیاسی لیڈری کرتیں - روز نامہ' ہفت روزہ' ماہنامہ تین تین پرچوں کو چلاتی رہتیں - مولانا محمد علی ایک ہی وقت میں مسلمانوں کے سب سے محبوب و ممتاز لیڈر بھی تھے' اور ایک اردو روزنامہ اور ایک انگریزی ہفت روزہ کے ایڈیٹر بھی' ادیب و شاعر بھی نقاد و مورخ بھی' جامع مسجد کے واعظ ہیں اور کانگرس کے صدر بھی ——— تو ایک طرف تو مغالطۂ عامہ الورود کی طرح یہ دماغ بھی عامہ الورود ہوے' دوسری طرف ایسے دماغ بھی ملتے ہیں

ن کا دائرہ ذوق بہت ہی مختصر اور محدود ہوتا ہے
لیکن وہ جو چیز بھی لے لیتے ہیں اُسی کے ہو رہتے ہیں۔
اور ان کے انہماک و استغراق پر انگلیاں اُٹھنے لگتی ہیں۔
سقراط کی بابت مشہور ہے کہ جب کسی مسئلے پر غور و فکر
میں ہوتا۔ تو اگر کھڑا ہوتا تو رات بھر کھڑا ہی رہ جاتا۔
نیوٹن جب کسی سفر کی ادھیڑ بن میں ہوتا تو کھانے کے وقت
بھی یوں ہی گزر گزر جاتے۔ ہیگل برلن میں ایک کتاب لکھ
رہا تھا۔ شہر میں دشمن کے گولے آ آ کر پھٹتے رہے اور اُسے
خبر نہ ہوئی۔ لکھنؤ کے ایک عالم کے بارے میں سننے میں
آیا ہے کہ شروع رات میں وہ ایک کتاب دیکھنے میں مشغول
ہوئے اور جب نماز صبح کی اذان ہوئی، جب چونکے۔

تو غرض یہ کہ قوت توجہ کے لحاظ سے ماہرین فن نے
انسانی دماغ کی ساخت دو طرح کی بتائی ہے:۔

(۱) ایک اس قسم کے دماغ جن میں شعور کی شعاعیں
عموماً خوب چوڑی چکلی پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ گویا ہر
چیز کو اپنی گرفت کے پنجے میں لیے ہوئے۔ ایسے لوگ اپنی
نظر کی وسعت و جامعیت و ہمہ گیری کے لیے مشہور ہوتے ہیں۔

(۲) دوسرے اس قسم کے دماغ جن کی شعوری شعاعیں
کسی ایک مرکزی نقطے پر یکجا مجتمع ہوتی ہیں۔ گویا
"ایک گیر و محکم گیر" کے مجسمے۔ ان لوگوں کی شہرت، دقت نظر
عمق اور نکتہ رسی کے لحاظ سے ہوتی ہے۔

دماغ کی یہ دونوں قسمیں بڑی حد تک فطری اور
طبعی ہوتی ہیں۔ تربیت اور کسب و اکتساب، تعلیم وتعلم

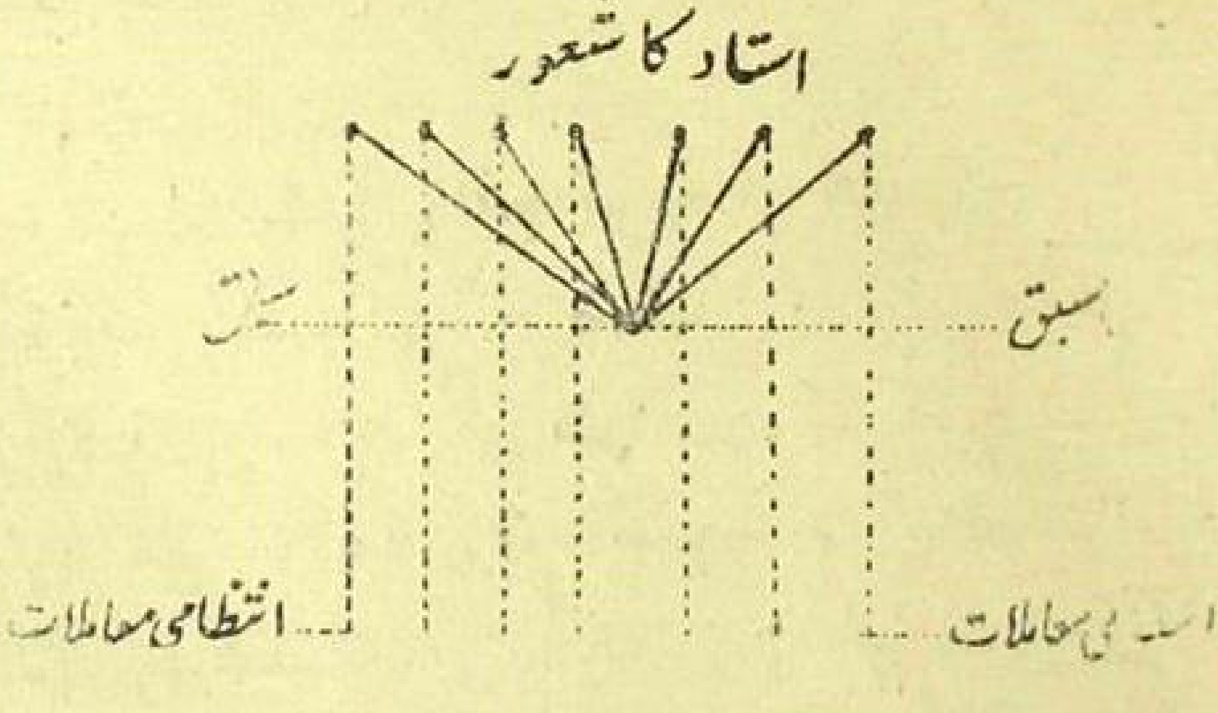
کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے - مگر ایک خاص حد سے زیادہ نہیں - دونوں قسم کے دماغ اپنی اپنی جگہ قابل قدر ہیں - اور کائنات کے موجودہ ارتقاء میں یکساں دونوں کا ھاتھ شامل ھے - غیرضروری بلکہ غیراہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں - البتہ اتنا کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، کہ بعض علوم فنون کو مناسبت پہلے قسم کے دماغ سے زیادہ ہوتی ھے اور بعض کو دوسرے سے ——— فلسفہ، منطق، ریاضیات وغیرہ جن کا زیادہ تعلق مجردات سے ھے اور جو خالص ذہنی قسم کے علوم ہیں - ان پر توجہ کرنے والے کو یکسوئی، انہماک، مرکزیت خیال کی حاجت خاص طور پر رھتی ھے - لیکن جو علوم مادی ہیں - یعنی ان کا تعلق اصلاً کائنات خارجی کے مشاہدوں اور تجربوں سے ھے مثلاً تاریخ، فقہ، قانون وغیرہ، ان کے طلبہ کو ایک ہی وقت میں نظر مختلف اور متعدد چیزوں پر رکھنا پڑتی ھے - اس لیے ان کے لیے دوسری ہی قسم کے دماغ موزوں ہیں -

جن استادوں اور معلموں کے سپرد کلاس کی نگرانی اور کم عمر طلبہ کی تعلیم ہوتی ھے - ان کے لیے نیوٹن اور ھیگل کے طرز کا یک رخہ دماغ رکھنا بہتر نہیں - سبب یہ ھے کہ ان کا کام صرف درس یا لکچر اتنے پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ طلبہ اور درجے کی انتظامی حالت پر بھی اُنھیں پوری نگاہ رکھنی ہوتی ھے - کوئی طالب علم آپس میں باتیں تو نہیں کر رہا ھے - کوئی اِدھر اُدھر تو نہیں دیکھ رہا ھے - کوئی بےقرینہ بیٹھا ہوا شور تو نہیں مچا رہا ھے - اس قسم کی ساری نگرانیاں استاد

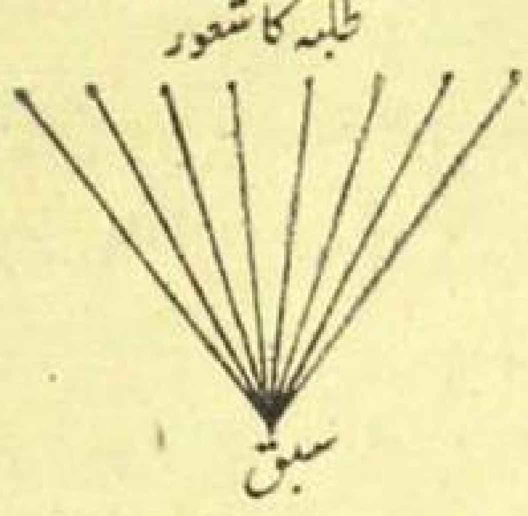
کے ذمے ہیں - کوئی نومشق استاد تو یہ بار سنبھال ہی نہیں سکتا - البتہ مشق و مہارت کے بعد زیادہ زحمت باقی نہیں رہ جاتی اور اُسے ملکہ حاصل ہوجاتا ہے کہ درس پر اپنی توجہ کے صرف ایک جزو کو مرکز بنائے رہے - اور توجہ کے باقی اجزاء کو نگرانی اور دوسرے معاملات پر پھیلا دے ————

طلبہ کی توجہ کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے - ان کی توجہ انتشار کی نہیں مرکزیت کی طالب ہے - ان کی ساری توجہ کا مرکز درس ہی کو رہنا ہے - ہلکی بےتوجہی سے بھی مطالب ان کی ذہن کی گرفت سے رہ جائیں گے -

استاد کی توجہ اور طلبہ کی توجہ درس کے لحاظ سے جو نسبت معکوس رکھتی ہے اس کی وضاحت ذیل کے نقشوں سے بہ آسانی ہو جائے گی -



شعور کا ایک جز درس کو اپنا مرکز بنائے ہوئے ہے
باقی اجزاء انتظامی معاملات پر پھیلے ہوئے ہیں -



شعور تمام تر درس کو مرکز بنائے ہوئے ہے -

اوپر گزر چکا ہے کہ مویدات توجہ فلاں فلاں اسباب و حالات ہوتے ہیں - اب ایک نظر موانع توجہ پر بھی کرلی جائے - یعنی اُن اسباب و حالات پر جو ذہن کو کسی شے پر کامل توجہ صرف کرنے سے روکتے ہیں -

موانع توجہ کی بڑی قسمیں دو ہیں :— مادی اور ذہنی -

(الف) پہلے مادی موانع توجہ کو لیجیے -

(۱) ضعف جسمانی :- ضعف کسی مستقل مرض یا پیرانہ سالی کا نتیجہ ہو، یا طبیعت کے عارضی اضمحلال سے پیدا ہو گیا ہو، ماحصل ہر صورت کا یہ ہے - کہ کمزور قوی توجہ کی کسی زبردست سعی کا تحمل نہ کر سکیں گے -

(۲) خستگی و تکان - وقتی کسل مندی بھی ضعف جسمانی سے ملتی ہوئی کیفیت بلکہ اسی کی ایک مخصوص و متعین شکل کا نام ہے -

(۳) شور و ہنگامہ - توجہ نام ہے کسی درجے کی یکسوئی کے ساتھ کسی مہیج کی طرف مشغول ہونے کا - جب جب توجہ کے لیے متعدد اور کثیر مہیج کشاکش کرنے لگیں گے - (اور یہی حاصل ہے غل غپاڑے کا) تو ظاہر ہے کہ شعور یکسوئی کسی درجے میں بھی مشکل ہی سے حاصل کر سکے گا ـــــــ سکون و خلوت کو یکسوئی کا جو لازمہ اہل تجربہ نے قرار دیا ہے - اس کا یہی راز ہے -

(۴) ناموافق ماحول :- کمرے کے اندر حبس سے گھٹن، بہت زیادہ گرمی، بہت زیادہ سردی، ہجوم کی چپقلش، و قس علیٰ ہذا، ان سب صورتوں میں اعصاب دماغی جدوجہد سے معطل یا نیم معطل ہو جاتے ہیں - اور یکسوئی میں لازماً خلل پڑ جاتا ہے -

(۵) نامناسب ہیئت جسمی :- فکر و توجہ کے وقت ہر شخص کی ایک خاص وضع و ہیئت جسمی بھی ہو جاتی ہے - اور یکسوئی میں معین رہتی ہے - اور جب اس کے خلاف ہو جاتا ہے - تو قیام توجہ میں دشواری پیش آنے لگتی ہے ــــ بعض شاعروں کو دیکھا ہو گا کہ فکر سخن کے وقت ٹہلتے رہتے ہیں - اور اس حال میں اگر انہیں ٹہلنے سے روک دیا جائے تو معاً آمد مضامین بھی رک جاتی ہے - اور گویا مضمون دماغ سے گم ہو جاتا ہے ـــــــ مکتبوں کے بچوں کو بارہا دیکھا ہو گا، کہ جب پڑھنے اور یاد کرنے لگتے ہیں تو خوب ہلتے بھی جاتے ہیں ـــــــ گویا جسمانی جنبش اور دماغی حرکت کے درمیان رشتۂ تلازم قائم ہو جاتا ہے -

جسمانی کاہلی اور سستی اکثر دماغی کاہلی اور سستی کے ساتھ ساتھ چلتی ھے - اور عموماً جس وقت نظام جسمی چاق و مستعد ہوتا ھے وہی وقت دماغ کے حاضر ہونے کا بھی ہوتا ھے - لیکن یہ قاعدہ صرف اکثری ھے - کلی نہیں -

(ب) اب توجہ کے ذہنی موانع پر نظر کیجیے - ان کی بھی تعداد اتنی ہی ھے، اور اہمیت میں بھی یہ مادی موانع سے کم نہیں -

(۱) طبعی نامناسبت :- یعنی مضامین سے بعض افراد کو، بغیر کسی ظاہری یا قریبی سبب کے طبعاً ہی نامناسبت ہوتی ھے - کسی کی طبیعت ریاضی سے اُچاٹ رہتی ھے - کسی کا دل شاعری میں نہیں لگتا - یہ سب اسی کی نظیریں ہیں -

تاہم کسی نہ کسی مضمون سے ہر شخص کو مناسبت ہی ہوتی ھے - تو ایسے لوگوں کو چاہیے کہ اپنے دل‌کش اور مرغوب مضمون کو واسطہ اور پل بنا کر غیر دل‌کش غیر مرغوب مضمون سے مناسبت پیدا کریں - اور اسے یاد رکھیں کہ ہر مضمون کسی نہ کسی حیثیت سے دوسرے مضمونوں سے بھی ربط و تعلق ضرور رکھتا ھے - یہ اور بات ھے کہ واسطے کی درمیانی کڑیاں خفی اور مخفی ہوں ——— استاد اگر صاحب فہم ھے تو وہ یہی کرے گا کہ اپنے شاگرد کے طبعی ذوق اور رجحان کو جو مضمون اس کے لیے دل‌کش ہو- اسی کی وساطت سے دوسرے غیر دل‌کش مضمونوں میں اس کے لیے کشش پیدا کر دے -

(۲) تردد و پریشانی :- انتشار ذہنی بداہتاً یکسوئی کے

منافی ہے۔

(۳) اجنبیت و غرابت :- مہیج کی مانوسیت جس طرح دل کشی کی طرف ہوتی ہے۔ نامانوسیت اور غرابت اسی نسبت سے ذہن کو وحشت کی طرف لے جاتی ہے۔

(۴) ذکاوت و ذہانت :- فطری ذکاوت و ذہانت کی تیز روشنی اکثر یکسوئی اور مرکزیت توجہ کے حق میں بلا ثابت ہوتی ہے۔ (یہاں فارسی کا مشہور مصرع یاد کرلیجیے —

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی)

ذہین و ذکی طلبہ اکثر اپنی خوش دماغی کے اعتماد پر غور و توجہ کو اپنے لیے ضروری ہی نہیں سمجھتے۔ اور اس کی روک تھام اگر شروع ہی میں نہ کردی گئی تو مستقل عادت اس بےتوجہی کی پڑ جاتی ہے۔ اور اب کوشش اور قصد کے بعد بھی مرکزیت توجہ آسان نہیں رہتی —— استاد کو چاہیے کہ ذہن و ذکی طلبہ سے سوالات خاص طور پر کرتا رہے کہ وہ توجہ اور یکسوئی کی اہمیت سے غافل نہ ہونے پائیں۔

(۵) مہیج کا جمود :- اوپر گزر چکا ہے کہ دل کشی کا ایک عنصر مہیج کا تنوع ہے۔ مہیج میں اگر انداز مناسب سے زاید دیر تک یکسانیت قائم رہے گی تو طبیعت اُچاٹ ہو جائے گی —— دانشمند استاد وہ ہے جو درجے میں کچھ دیر زبانی تقریر کرتا ہے۔ کچھ دیر طلبہ سے سوال و جواب کرتا ہے۔ کچھ اپنے نوٹ لکھاتا ہے۔ کبھی کوئی قصہ، حکایت بیان کر دیتا ہے۔ غرض اسی طرح ادل

بدل کرتا رہتا ہے - مسلسل تقریر ہی کیے نہیں چلا جاتا -

بعض تذکرے اس قسم کے پڑھے یا سنے ہوں گے - کہ فلاں حکیم یا فلسفی اپنے فن کے ماہر و کامل، دنیا کی عام اور موٹی باتوں میں بالکل ناسمجھ تھے - بہ ظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے - لیکن ہے یہ کہ شعور کا طبعی رجحان اور فطری میلان انتشار اور پھیلاؤ کی جانب ہے - اس میں بہ جبر و تکلف، اجتماع و مرکزیت ایک مدت طویل تک قائم رکھنا اسے ایک غیرطبعی حالت میں رکھتا ہے - چنانچہ توجہ کو عرصہ دراز تک یکسو رکھنے سے دماغ پر بار پڑنے لگتا اور دماغی خستگی محسوس ہونے لگتی ہے - اور ذہن میں دوسرے مشغلوں کی طرف التفات کرنے کی صلاحیت بہت گھٹ جاتی ہے - اسپنسر نے خوب کہا ہے کہ فطرت بہت سخت محاسب ہے - کسی ایک مد میں اگر زیادہ خرچ ہو جاتا ہے تو وہ دوسری مدوں سے اتنا ہی کاٹ لیتی ہے - بس جو فلسفی یا غیر فلسفی کسی ایک مسئلے پر مرکزیت، یکسوئی کے ساتھ صرف توجہ کرتے رہتے ہیں تو اس کا نتیجہ قدرتاً یہ نکلتا ہے کہ دوسری چیزوں کی طرف سے توجہ کم ہو جاتی ہے - اور عام ملکۂ توجہ ایک بڑی حد تک مردہ و مضمحل ہو کر رہ جاتا ہے -

عمل توجہ میں یہ نہیں ہوتا کہ انسان کے آلات و حواس بجز ایک سمت کے ہر طرف سے معطل ہو جائیں - انسان میں نفس اِحساس ہر چیز کا رہتا ہے - لیکن دماغ پر اثر قائم

اُسی شے کا ہوتا ہے جو اس کے زیر توجہ ہوتی ہے — — — —

یوں سمجھیے کہ شعور پر ماحول سے بیشمار تیر ایک ہی وقت میں چلتے رہتے ہیں — مگر ٹھیک نشانے پر جا کر پیوست ہونے والا ایک ہی تیر ہوتا ہے باقی سب گو اس پر پڑتے ہیں، لیکن بس اس طرح کہ اچٹتے ہوئے سے لگے — اور چھچھلتے ہوئے نکل گئے — — — بے توجہی کی حالت میں یہ نہیں ہوتا کہ انسان اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو سرے سے دیکھتا یا سنتا ہی نہیں، یا یہ کہ آلۂ سماعت، آلۂ بصارت اپنی اصلیت چھوڑ دیتے ہیں البتہ یہ ہوتا ہے کہ دماغ اس وقت اُن سے کوئی دیرپا اور گہرا اثر ذرا بھی قبول نہیں کرتا تھیجات درآور داخل برابر ہوتے رہتے ہیں لیکن دماغ پر کوئی قابل ذکر و قابل لحاظ نقش نہیں بناتے — — — ہوا کے تھپیڑوں نے پانی کی چادر میں آن کی آن تموج پیدا کیا، بابلے ابھی اُبھرے، ابھی بیٹھ گئے —

یہ مشاہدہ تو بارہا ہوا ہوگا کہ استاد درجے میں پڑھا رہا ہے — لڑکے توجہ سے سن نہیں رہے ہیں بلکہ آپس میں باتیں کرنے میں لگے ہوئے ہیں — اتنے میں استاد نے کوئی قصہ بیان کرنا شروع کیا، اور معاً درجے میں خاموشی چھا گئی — بات چیت موقوف، سب کے کان اس طرف لگ گئے — — — یہ ایک نظیر ہے اس کلیے کی، جو ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے — استاد کی زبان سے نکلنے والے لفظ پہلے بھی طلبہ کے کانوں میں پڑ رہے تھے، لیکن اُن سے چونکہ انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی، اس لیے ان لفظوں سے دماغ میں کوئی مفہومی کیفیت

پیدا نہیں ہوتی تھی اور بات سنی آن سنی رہتی تھی - اب قصہ جو شروع ہوا تو اس کے لفظ چونکہ دلچسپی کا سامان رکھتے تھے، یہ جوں ہی دماغ تک پہنچے - دماغ نے ان سے اثر قبول کرنا شروع کیا - اور لڑکے ہمہ تن شوق، ہمہ تن توجہ بن گئے -

توجہ کی تحلیل نفسی کے سلسلے میں ایک ضمنی گو خاصا اہم سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ ایک آن میں نفس بشری کتنی چیزوں پر توجہ قائم رکھ سکتا ہے ؟ نفسیین نے اِس سوال کے جواب میں بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں - لیکن کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک چیز پر یہ بات ممکن ہے (اور ممکن ہی نہیں، ایسا ہوتا بھی رہتا ہے) کہ وہ ایک شے بجائے خود کئی کئی چیزوں یا کئی کئی حصوں پر شامل ہو - لیکن نفس کے سامنے موجود ہونے کی حیثیت سے وہ حکم واحد میں داخل ہو گیا - یہ ٹھیک ہے کہ انسان ایک ہزار روپیے پر ہی توجہ، ایک ہی وقت میں قائم رکھ سکتا ہے لیکن ہزار روپیوں پر فرداً فرداً نہیں، بلکہ ایک ہزار کی مجموعی رقم پر - اور یہ جو بظاہر نظر آتا ہے کہ فلاں شخص ایک ہی وقت میں کئی کئی چیزوں پر متوجہ ہے یا مثلاً یہ روایت کہ، قیصر جولیس ایک ساتھ چار چار خطوں کے مضمون بولتا جاتا تھا، اور پانچواں خط خود لکھتا جاتا تھا - سو ان صورتوں میں یہ نہیں ہوتا کہ انسان بعینہ آن واحد میں مختلف اور متعدد چیزوں پر صرف توجہ کرتا ہے - بلکہ اس کی توجہ مختلف متعدد چیزوں پر باری باری اس تیزی کے

ساتھ منتقل ہوتی رہتی ہے کہ سارا سلسلہ بظاہر ایک ہی اور غیر منقطع معلوم ہوتا ہے ——— بجلی کے شرارے ایک سکنڈ میں تعداد میں بےشمار خارج ہوتے رہتے ہیں - دیکھنے میں نگاہ کو بجلی کی ایک ہی لہر معلوم ہوتی ہے -

ہر شے اپنی ضد و مقابل سے پہچان لی جاتی ہے - جس نے نیکی کو پہچان لیا وہ بدی سے بھی واقف ہو گیا، جو روشنی کا مفہوم سمجھ گیا وہ تاریکی سے بھی ناواقف نہیں رہا - مشغولیت کے ضمن میں ناظرین بےشغلی سے بھی کسی حد تک ضرور واقف ہو گئے - یہ بےشغلی اور بےتوجہی کی کیفیت ہے ہی ایسی عام و عالمگیر کہ اس کے لیے کسی مخصوص تعارف کی ضرورت نہیں - ہر شخص کم و بیش اس کا ذاتی تجربہ رکھتا ہے ——— آنکھیں کھلی ہیں - مگر نظر کسی شے پر قائم نہیں - خالی پڑے ہوئے ہیں، دل کسی کام میں نہیں لگ رہا ہے - وقت بےکار گزرتا جاتا ہے - پلنگ یا آرام کرسی سے ہلنے کو، اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا - اندر ہی اندر یعنی شعور خفی میں یہ خیال ضرور گذر رہا ہے کہ اُٹھ کر فلاں فلاں کام کرنا چاہیے لیکن کاہلی اُٹھنے نہیں دیتی - عدم مشغولیت دماغ پر مسلط ہے، طلسمی فانوس (میجک لینٹرن) یا سنیما کی تصویروں کی طرح جلدی جلدی ایک خیال دوسرے کی جگہ لیتا ہے - اور قوت فاعلی گویا معطل ہے - یہاں تک کہ ایک عرصے کی بےکاری، تعطل کے بعد جمود از خود حرکت سے بدلتا ہے - قوت فاعلی از سر نو پیدا ہو جاتی ہے - اور اُسی گھڑی پھر کوئی مشغولیت شروع

ہو جاتی ہے ——— جس طرح یکسوئی و انہماک نام ہے شعور میں انتہائی اجتماع مرکزیت کا - اسی طرح بے توجہی اس کیفیت نفسی کا نام ہے جس میں شعور کا انتشار اور پھیلاؤ اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہو -

———

اوپر عمل توجہ کی ماہیت نفسی تفصیل سے بیان ہو چکی - توجہ کیا ہے، شعور سے اس کا کیا تعلق ہے، اس کی خاص خاص قسمیں کیا کیا ہیں، کن کن حالات و اسباب سے پیدا ہوتی ہے، کن کن سے تربیت و ترقی پاتی ہے، اس کے اہم خصوصیات کیا کیا ہیں، اس کی راہ میں رکاوٹیں کیا کیا ہیں، اس قسم کے سارے سوالات کے جوابات مل چکے - لیکن تعلیم اور فن تعلیم سے توجہ کو جو گہرا تعلق ہے - اس کے لحاظ سے یہ مناسب ہوگا کہ ختم بیان پر اس کی چند تعلیمی تفریعات پر بھی ایک سرسری نظر کر لیں - یعنی جو معلومات اب تک حاصل ہوے ان کا انطباق چند مختصر لفظوں میں تعلیم پر کرتے چلیں -

یہ حقیقت واضح ہو چکی کہ نامانوس اور اجنبی اشیاء سے ذہن کو طبعاً وحشت ہوتی ہے اس لیے، مانوس، مالوف معلوم اشیاء کو زینہ بنانا چاہیے، نامعلوم، ناموس، غیر مالوف اشیاء کی تعلیم کا - یا دوسرے لفظوں میں استاد کو آسان سے دشوار، معلوم سے مجہول، کی طرف طلبہ کو تدریجاً لے چلنا چاہیے -

جو چیزیں ہر وقت مشاہدے اور تجربے میں آ سکتی ہیں یا حسی ہیں، وہ زیادہ صاف سہل و قریب الفہم ہوتی ہیں - بہ مقابلہ اُن مسائل کے جو مجرد ہوتے ہیں اور محض عقلی یا فکری حیثیت رکھتے ہیں - اس بنا پر دوسری ہدایت یہ ہاتھ آتی ہے کہ طلبہ کو مادیات سے مجردات اور محسوسات سے معقولات کی طرف قدم اُٹھانا چاہیے -

یہ بھی گذر چکا ہے کہ موُثریت توجہ اور یکسوئی سے دماغ پر پورا بار پڑتا ہے - کم عمر طلبہ اسے زیادہ برداشت نہیں کر سکتے - توجہ کو عرصے تک قائم و یکسو رکھنے کے لیے کافی مشق و تربیت کی ضرورت ہے - کم عمر طلبہ سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی - نتیجہ یہ نکلا کہ کم عمر لڑکوں کے روزانہ درس کی مدت بجائے طویل کے مختصر رہنا چاہیے -

یہ بھی معلوم ہو چکا ہے - کہ توجہ کا اصل اصول ذوق و دلکشی ہے اور ذوق کا جبروتشدد سے پیدا ہونا ممکن نہیں - اس لیے سزا کی ناگزیر صورتوں کے سوا عموماً طلبہ کو سمجھا بجھا کر شفقت ہی کے ساتھ، (نہ کہ دہشت کے سہارے) تعلیم دینا چاہیے -

ذوق و دلکشی کا بڑا ضامن مہیج کا تنوع ہے - تعلیم میں اسی اصول سے کام لیجیے اور قاعدہ یہ بنا لیجیے کہ - درس میں تنوع و تفنن ضرور ملحوظ رکھا جائے -

دسواں باب

خود بینی و خود نمائی

بھڑ، مکھی یا شہد کی مکھی جب اکیلی یا پھتیل ہوتی ہے، اور اپنا گھر بنانا چاہتی ہے تو جاننے والوں کا بیان ہے کہ ہمیشہ بیلن کی شکل کا یا نیم بیضوی بناتی ہے۔ لیکن وہی مکھیاں جب بہت سی اکٹھی ہو جاتی ہیں اور اب جو چھتا بننے لگتا ہے، تو وہی جاننے والے کہتے ہیں کہ اب اس کی شکل و ہیئت ہی دوسری ہوتی ہے۔ اب طرز تعمیر ایسا نہیں رہتا جو ایک دوسرے سے ٹکر لے، بلکہ اب خانوں خانوں کے درمیان ایک اوٹ یا پردے کی دیوار سی چوڑی چوڑی حائل رہتی ہے۔ کہ نہ ایک کو تکلیف ہو نہ دوسرے کو ——— ایک کو دوسرے کا خیال کر کے اپنی آزادی پر حدبندی عائد کرنی پڑی، اور بجائے پھیلنے کے کچھ سکڑنا، کچھ دبنا پڑا۔ لیکن ساتھ ہی دوسروں کی ہمدردی و ہم عملی بھی حاصل ہوگئی۔ تعمیر میں جو وقت اور قوت ایک ایک کو صرف کرنا پڑی اس میں سب کو بچت ہو گئی، اور ایک ایک کو اپنی حفاظت کے لیے ہمدردوں کی ایک پوری فوج کی فوج مل گئی۔

———

لوہار جب لوہے کی سلاخ کاٹنا چاہتا ہے، تو پہلے اُسے آگ میں تپاتا ہے۔ گرمی پا کر ایک دوسرے چمٹے ہوئے

ذرات الگ الگ ہونے لگتے ہیں - اور اس انتشار سے ان کی تفریق تجزی آسان ہو جاتی ہے ——— ہر انفرادی ذرے کو آزادی پوری حاصل ہو گئی اور اجتماع کی قوت ضعیف ہو گئی -

ڈیری میں جب گھی، مکھن، دہی جمانا ہوتا ہے تو انھیں ٹھنڈک میں رکھ دیا جاتا ہے - ٹھنڈک پاکر ان کے منتشر ذرات جڑنے اور جمنے لگتے ہیں - اور جو چیز پہلے رقیق یا سیال تھی وہ اب جم جاتی ہے ——— ذرات کی آزادی محدود ہو گئی - لیکن مجموعے میں ٹھوس پن اور صلابت پیدا ہو گئی -

بھیڑ، بکری کے گلے، گائے بھینس کے جھنڈ پر، گلے اور جھنڈ کا اطلاق اُسی وقت تک ہوگا جب تک کہ ساری فردیں ایک ہی راہ پر چل رہی ہیں - اور اپنی انفرادی حیثیت کو جماعت کے تابع کئے ہوئے ہیں - لیکن ہر فرد اگر اپنی اپنی راہ چلنے لگے تو ظاہر ہے کہ گلے یا جھنڈ کا اطلاق ذرا دیر بھی نہ رہ سکے گا - اور اجتماع معاً شکست ہو جائے گا —

جاندار و بےجان، حیوان، انسان، ساری مثالوں پر نظر کرنے سے قانون یہ ہاتھ آیا کہ جماعت کا پہلا اثر افراد پر ان کی آزادی کی حدبندی ہے - اور جماعت چونکہ خود افراد ہی سے مرکب ہوتی ہے، تو گویا اسی قانون کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر فرد پر دوسرے افراد کا اثر اُس فرد کی آزادی پر حدبندی ہوتا ہے -

اس اصل اصول سے جو اصول ثانوی نکلتے ہیں، تجربے مشاہدے کی روشنی میں اب اُن پر ایک نظر کرتے چلیے -

(ا) دوسروں کا محض وجود ہی فرد کی آزادی کی تحدید کر دیتا ہے - اور اس کے اوپر ایک امتناعی اثر رکھتا ہے -

بچوں کو دیکھیے یوں کیسی شوخیاں کرتے رہتے ہیں - لیکن ذرا کوئی غیر آدمی آ گیا، تو کیسا شرما جاتے ہیں - لجا جاتے ہیں - اب نہ وہ شوخی ہے نہ تیزی - سر جھکائے ہیں، آنکھیں نیچی کیے ہیں، معمولی سوال کا جواب بھی نہیں دیتے ——— بچوں سے گزر کر بڑوں اور بوڑھوں پر آئیے ہم آپ، سب کیا کرتے رہتے ہیں یہی کہ جو آزادی عمل تنہائی میں حاصل رہتی ہے، دوسروں کے سامنے اس کی آدھی بھی باقی نہیں رہ جاتی - اکیلے میں جس طرح چاہیں لیتیں، بیٹھیں، اُچکیں، پھاندیں، دوڑیں لگائیں، گائیں گنگنائیں - لیکن ادھر کوئی ملنے ملانے آ گیا، اُدھر ہر آزادی پر قید لگ گئی - اور سامنے آ جانے والا اگر کوئی اجنبی ہے جب تو بڑی سخت قیدیں آزادی پر لگ گئیں - غیروں کے سامنے ادب قاعدے سے بیٹھے جانا پڑا، نہ جی بھر کر ہنس کھیل سکتے ہیں - نہ آزادی سے کھا، پی سکتے ہیں - نہ سو سکتے، نہ لیٹ سکتے ہیں -

بہتوں کو دیکھا ہوگا کہ لکھنے والے بہت اچھے ہیں تحریر میں ہر طرح کے اظہار مطالب پر قادر، انشاپرداز اور صحیح معنی میں قادرالکلام، لیکن بولنے کو کہیے تو چھوٹے

سے مجمع کے سامنے بھی زبان کھولنے پر قادر نہیں، مجمع کا سوال بھی چھوڑیے - اپنے مخالف پر آپ کو اس کے پیچھے غصہ آ جاتا ھے کہ وہ کہیں مل جائے تو آپ اس کی خوب خبر لیں - اُسے دندان‌شکن جواب دیں لیکن جب سامنا ھو جاتا ھے - تو آپ کی زبان نہیں چل پاتی - دل میں بہت کچھ غبار بھرا ھے - لیکن گویائی ساتھ نہیں دے رھی ھے - اُسی کو آپ خط لکھ بھیجتے ھیں تو اس میں خوب دل کے حوصلے نکال لیتے ھیں - ایک اور مثال لیجیے - محبوب سے ملنے کی آپ کو بڑی تمنا ھے - اور دل میں خوب خوب ارمان اور ولولے ھیں کہ ملاقات کے وقت خوب قصۂ دل کہہ سکیں گے - ملاقات ھوتی ھے، لیکن اب وہ زبان کی ساری طراری غائب، مشکل ھی سے کوئی بات نکل پاتی - اور معاملہ خط پر اُٹھ رھتا ھے! ——— ان سب مثالوں میں چاھے "رعب" سے تعبیر کیجیے، چاھے "مروت" کہیے بہرحال دوسرے یا دوسروں کا سامنا ھی آزادیِ گفتار میں حائل ھو جاتا ھے - خطوط میں اور اپنے روزنامچوں میں لوگ کیسی کیسی باتیں لکھ جاتے ھیں - بے‌تکلف اور گہرے دوستوں کے سامنے بھی اپنی زبان سے ادا کرتے حیا آتی ھے - یہ سب مثالیں بھی اسی کلیہ کی ھیں -

اور تو اور، بعض مجنونوں اور مخبوط‌الحواسوں کے لیے یہ بارھا پیش آیا ھے، کہ اپنے عزیزوں قریبوں، دوستوں کے سامنے تو وہ برابر بہکی بہکی باتیں کرتے رھے - اپنے قول و عمل سے برابر اپنے خبط و جنون کا ثبوت دیتے رھے، لیکن

ادھر مجسٹریٹ یا کسی اجنبی ڈاکٹر کے سامنے معائنے کے لیے پیش ہوئے اور ادھر سنبھل کر بیٹھ گئے - گویا آپ مجنون ھی نہیں - اور سیدھی، سیدھی باتیں کرنے لگے ـــــ یہاں بھی کارفرما وھی قانون ھے - کہ فرد کی ذہنیت تنہائی میں یا اپنوں کے سامنے کچھ ہوتی ھے اور بیگانوں کے سامنے کچھ اور یہاں تک کہ خبطی اور جنونی فرد کی بھی -

(۲) یہ اثر جب دوسروں کے محض وجود کا پڑ جاتا ھے تو دوسروں کی توجہ کا اثر تو ظاہر ھے کہ قوت میں کئی گنا زاید ہو گا - اگرچہ یہ لازمی نہیں کہ نوعیت میں بھی ھمیشہ وھی ہو -

سنسان سڑک کی ایک پٹری سے دوسری پٹری پر کسی کو جانا ھے یا اپنے لمبے برآمدے یا دالان ھی میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچنا ھے، تو اس سے بڑھ کر آسان امر اور ھے ھی کیا ؟ نہ کچھ سوچنے کی ضرورت، نہ کسی خاص اہتمام کی - بس ایک دفعہ ارادہ کیا اور ادھر سے اُدھر پہنچ گئے - کھٹ سے آرپار ہو گئے - بلکہ ایسے موقع پر سوچ سوچ کر ایک ایک قدم اٹھایا تو اور دیر لگ جائے گی اور کچھ تھکن ھی سی پیدا ہونے لگے گی - لیکن اب فرض کیجیے کہ اسی قدر فاصلہ، چند فٹ یا چند گز کا سنسان سڑک یا دالان کا نہیں، بلکہ کسی تماشہ گاہ کا ھے جو تماشہ گر کو طے کرنا ھے تماشہ گاہ تماشائیوں سے لبریز ھے - سب کی نگاھیں تماشہ گر پر لگی ہوئی ھیں - تماشہ گر اگر خوب

منجا ہوا نہیں ہے تو بس ایہ معلوم ہوگا کہ چند قدم چلنا، نہیں، بلکہ قلعہ کو سر کرنا ہے، ایک ایک قدم پر اوھے لگ جائیں گے۔ اور ایسا محسوس ہونے لگے گا کہ جیسے اپنی ٹانگیں اپنے کہے میں نہیں۔ گوشت پوست کی نہیں، پتھر و فولاد کی ہیں۔

ایک شعر یوں آپ کو بخوبی یاد ہے۔ بارہا آپ اُسے گنگنا چکے ہیں۔ لیکن ذرا اُسے پہلے پہل کسی مجمع میں تو پڑھ کر سنائیے۔ یاد ہی نہ پڑے گا۔ کچھ لفظ معلوم ہوتا ہے حلق میں آٹکے رہ گئے۔ قرآن کی جو سورتیں، ایک نمازی کو حفظ ہیں، اور تنہا نماز میں برابر اُنھیں پڑھتا رہتا ہے۔ وہی سورتیں کہیے جہری نماز میں امام بن کر تو پڑھے۔ قادر نہ ہو سکے گا بار بار متشابہ لگے گا۔ دستکار یا کاریگر ایک کام تنہائی میں کرنا خوب سیکھ لیتا ہے لیکن اُسی کو کرتے ہوئے اگر دوسرے لوگ تماشہ بنا کر دیکھنے لگیں تو خواہ مخواہ گڑبڑا جاتا ہے۔ آدمی کی ہوئی عقل گم ہو جاتی ہے اور ہاتھ پیر جیسے پھول جاتے ہیں۔ ایک صاحب اپنے عزیزوں اور بےتکلف دوستوں کے سامنے خوب آزادی سے چہک لیتے ہیں لیکن انھیں سے کہیے کہ وہی الفاظ کھڑے ہو کر ایک مجمع کے سامنے دہرادیں تو ہیبت طاری ہو جائے گی۔ زبان لڑکھڑانے لگے گی۔ چہرے پر پسینہ آ جائے گا۔ اور دل کی بات دل ہی میں رہ جائے گی ——— یہ روزمرہ کی ساری مثالیں اسی قانون کی ہیں۔ کہ دوسروں کی توجہ کا احساس فرد کی ذہنیت کو اچھا خاصا بدل دیتا ہے۔

ایسے موقعوں پر ہوتا کیا ہے - ہوتا یہ ہے کہ نفس کی خودشعوری بڑھ جاتی ہے - جو افعال و حرکت اضطراری میں ازخود صادر ہوتے رہتے ہیں - ان پر وہ دھیان دینے لگتا ہے - اور قصد و اہتمام کے ساتھ کرنا چاہتا ہے - بس اسی سے اعصاب میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے - ایک ہنگامی فالج یا استرخاء کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے - اور ان اعمال کی سادگی اور بےتکلفی غائب ہو جاتی ہے -

(۳) کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کی خواہش داد جو طبعی ہے مگر اُسے مخفی رہنا چاہیے ایسے موقع پر اُبھر آتی ہے - اور دوسروں پر نمایاں ہو جاتی ہے کہ یہ حضرت اپنے عمل کی داد ہی چاہ رہے ہیں ——— یہ اُبھری ہوئی داد طلبی بنے ہوئے کام کو بگاڑ دیتی ہے - اور اتنا تو پھر حال ہو جاتا ہے کہ ایسے عمل میں قدرتی سادگی' بےتکلفی' آمد' باقی نہیں رہتی' بلکہ تصنع و آورد کی جھلک کسی درجے میں تو ضرور ہی آ جاتی ہے -

(۴) مشق و مہارت' شرم و جھجک کے اثرات کو دور کر دیتی ہے' جس طرح افیون کھاتے کھاتے پھر اُس مقدار میں وہ نشہ آوری باقی نہیں رہتی لیکن یہ نہیں ہوتا کہ دوسروں کی توجہ اپنا اثر دکھانا چھوڑ دے - یہ ہرگز نہیں ہوتا بلکہ وہی اثر اب دوسری صورت میں ظاہر ہونے لگتا ہے سابق صورت کے برعکس' دوسروں کی توجہ پہلے اگر زبان بندی کا کام دیتی تھی' تو اب زبان کشائی کا کام دینے لگتی ہے - پہلے جھجک پیدا کرتی تھی' اب وہی ہمت دلاتی ہے -

پہلے وہ حجاب اور مانع کے مرادف تھی - اب مہمیز اور تازیانے کا کام کرنے لگتی ہے ——— مشاق خطیبوں اور خوش بیان مقرروں کو دیکھا ہو گا - کہ حاضرین و سامعین کی کثرت سے نہیں بلکہ کمی سے گھبراتے ہیں خواہش اس کی نہیں رہ جاتی کہ لوگ ادھر نہ مخاطب ہوں یا کم مخاطب ہوں بلکہ اس کی پیدا ہو جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مخاطب ہوں - حاضرین اگر اونگھنے لگے یا دوسری طرف مخاطب ہو گئے۔ تو خطیب خوش بیان کی زبان چلتے چلتے رک سی جاتی ہے ——— یہ سارے شواہد اسی قانون کے ہیں - وہی محرک یعنی دوسروں کی توجہ جو مشق سے قبل کام نفی و سلب کا دیتا تھا پختہ مشقی کے بعد کام ایجاب و اثبات کا دینے لگتا ہے -

(۵) شرمیلا پن بعض افراد میں حد اعتدال سے بڑھا ہوتا ہے، جو ایک قسم مرض کی ہے - یہ لوگ جماعت کی نظر سے بالکل غائب ہو کر گوشہ نشین ہو جانا چاہتے ہیں - اور کسی کے سامنے آنا انہیں گوارا نہیں ہوتا - بعض اوقات ایسے لوگ اپنی جھیپ مٹانے کے لیے، اور محض یہ جتانے کے لیے کہ یہ جھیپتے نہیں ہیں، کوئی ایسی بے محل بات کہہ اٹھتے یا کر گزرتے ہیں، کہ لوگوں کے اور زیادہ مرکز توجہ اور انگشت نما بن جاتے ہیں -

بعضوں میں اس کے ٹھیک برعکس، شرمیلا پن حد اعتدال سے کم ہوتا ہے - اور اسی کا نام ڈھٹائی ہے - وہ بالقصد ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں، اور ان میں ذرا جھجک نہیں محسوس

کرتے ہیں کہ لوگوں کی نظریں اُن پر زیادہ سے زیادہ پڑیں اور ہر محفل میں انھیں کے چرچے ہوا کریں - اپنی نام آوری کی دھن میں اُنھیں اس کی بھی فکر نہیں رہتی ہے کہ نیک نامی حاصل ہو رہی ہے یا بدنامی - بدنامی کو بھی یہ عین اپنی ناموری سمجھتے ہیں - مشہور مصرع —

"بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا"

اسی ذہنیت کا ترجمان ہے -

---

(۷) اب تک گفتگو اس لحاظ سے تھی کہ دوسروں کی توجہ کا فرد پر کیا اثر پڑتا رہتا ہے - لیکن توجہ خالص اور بےآب و رنگ زیادہ عرصے تک رہ نہیں سکتی - لازمی ہے کہ جلد ہی اس میں کوئی رنگ پیدا ہو جائے - خواہ موافقت کا خواہ مخالفت کا، خواہ دوستی کا خواہ دشمنی کا، داد کا یا اعتراض کا، آفریں کا یا نفریں کا اور یہیں سے بنیاد پڑ جاتی ہے ایک طرف، عزت، محبوبیت، شہرت اور نیک نامی کی - دوسری طرف، ذلت، رسوائی، مبغوضیت اور بدنامی کی -

انسان کے دل میں یہ خواہش کوئی معمولی خواہش اور فرد کے لیے یہ جماعت میں ہر دلعزیزی و مقبولیت کا محرک کوئی ادنیٰ محرک نہیں - سوسائٹی کا نظم کہنا چاہیے کہ ایک بڑی حد تک اسی طبعی تقاضے کے سہارے قائم ہے - اخلاق کی اصطلاح میں اسی کا نام جاہ طلبی ہے - لیکن یہ ایک ذمیمے کی حیثیت جب ہی رکھتی ہے جب حد اعتدال سے بڑھ جائے -

ورنہ اپنی حدود کے اندر تو جاہ پسندی بالکل طبعی ہے - اور بہ طور عیب کے شمار ہونے کے قابل نہیں - یہ خواہش اگر حدود کے اندر ہے، تو یہی تو دنیا کی اکثریت کو سنبھالے ہوئے اور نظم و نظام اخلاق کی شیرازہ بندی کیے ہوے ہے ———

چوری سے بدچلنی سے، جعلسازی سے، ہر جرم و قصور سے اج خوف خدا کی بنا پر رکنے والے کتنے ہیں؟ ظاہر ہے کہ بہت کم، اور ایسی بدنامی اور فضیحتے کے ڈر سے رکنے والے کتنے؟ ظاہر ہے بہت زاید اور جس نسبت سے جماعت کا اخلاقی دباؤ کم ہوتا جاتا ہے - اسی نسبت سے افراد میں بےباکی بڑھتی جاتی ہے - اور صالحین کی تعداد سے کہیں بڑھ کر تعداد بدکرداروں کی ہو جاتی ہے -

(۸) شہرت و نیک نامی حاصل کرنے کے طریقے بہت سے ہیں - کوئی سا بھی بڑا کام علمی و عملی، دماغی و جسمانی، کسی بھی شعبۂ زندگی سے متعلق ہو - جسے عام لوگ نہ کر سکیں، یا جو اکثریت کی نظر میں غیرمعمولی ہو، اُسے کر ڈالنا، کھلا ہوا راستہ شہرت و ناموری کا ہے - شجاعت، ذہانت، مشقت، حاضر جوابی کی راہ سے اس منزل تک رسائی بہ آسانی ہو جاتی ہے - البتہ جس چیز کا نام محبت و عزت ہے، اس کے حاصل کرنے کے لیے کام کا صرف غیرمعمولی ہونا نا کافی ہے - اس کے لیے خدمت، اخلاص اور ایثار بھی ضروری ہے - بغیر اس کے لوگوں کے دلوں میں جگہ نہیں پیدا ہوتی - صرف زبان واہ، واہ کہہ دیتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ دماغ عش عش کرنے لگتا ہے -

یہ ہردلعزیزی اور مقبولیت ہی کی خواہش تو ہے جس کی بنا پر ہم اپنی کمزوریوں اور عیبوں کو خلقت کی نظر سے چھپاتے ہیں - اور اپنی واقعی یا غیرواقعی خوبیوں کا خوب اشتہار دیتے پھرتے ہیں لیکن دوسروں سے داد حاصل کرنے میں کامیابی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ -

(۱) اول تو ہم خود اپنی زبان سے اپنی داد نہ دیتے پھریں، ورنہ چھچھورے اور خودستا مشہور ہو جائیں گے - اور بجائے نیک نامی کے الٹی بدنامی ہاتھ لگے گی - انسان میں اگر واقعتاً فروتنی نہ ہو، تو بھی اُسے ظاہر تو تواضع و فروتنی ہی کرنا چاہیے - بغیر اس کے خلق کی نظر میں نیک نامی حاصل ہی نہیں ہو سکتی ———— نیک نامی کو جماعت اپنا عطیہ و انعام سمجھتی ہے - وہ فرد کی اس جسارت کو معاف نہیں کر سکتی، کہ اس نے جماعت سے بےنیاز ہو کر، یا اُس کے فیصلے کا انتظار کیے بغیر، اِس انعام کو اپنے لیے مخصوص کر لیا، اور سوسائٹی ایسے فرد کو سزا یہ دیتی ہے کہ اُس کا نام، خودبین، خودنما، خودپرست، رکھ دیتی ہے -

(۲) دوسری شرط اسی سے ملتی ہوئی، بلکہ اسی کی جلی شکل یہ ہے کہ داد کی خواہش فرد کے اندر کیسی ہی قوی کیوں نہ ہو، لیکن لازم ہے کہ وہ مخفی ہی رہے - اگر کہیں فرد نے داد علانیہ مانگنی شروع کر دی - اور اس کی داد طلبی دوسروں پر کھل گئی تو سوسائٹی پھر اس معاملے میں سخت بخل کرنے لگے گی - وہ تو اِسے اپنی طرف سے عطیہ و انعام سمجھتی ہے - اور انعام کہیں مطالبہ کرنے سے ملتا ہے ؟

انعام کے معنی ہی یہ ہیں کہ بطور لطف و بخشش عطا ہو۔

یہیں یہ شے کہ نفسیات کے دائرے حکماے اخلاق کی تعلیمات سے مل جاتے ہیں انھوں نے بھی تو یہی کہا ہے کہ خلق کی نظر میں بڑے بننا چاہتے ہو، تو خود اپنی نظر میں چھوٹے بنو ——— تواضع، انکسار میں عجب اثر ہے۔ دوسروں کی نظر میں یہی عادت معزز و مکرم بناتی ہے۔ یہاں تک کہ جو تواضع محض تصنع سے کی جاتی ہے اُس تک میں اثر موجود ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ خود یہ تصنع ایسا نہ ہو جو کھل جائے۔

گیارھواں باب

شرم و حیا

شرم و حجاب کے ہماری زبان میں دو معنی ہیں - ایک تو یہی کہ آدمی اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنے، اپنی بڑائی اپنی زبان اور حرکات و سکنات سے نہ کرے، اپنے کو بڑا ظاہر کرنے سے شرمائے - حجاب محسوس کرے، یہ شرم و حجاب انکسار تواضع کے معنی میں، اس خودبینی و خودنمائی کی ضد ہے جس کا ذکر ابھی پچھلے باب میں آچکا ہے - دوسرے معنی شرم و حیا کے یہ ہیں، کہ عورت و مرد کے تعلقات و معاملات پر کھل کر بیباکی سے گفتگو نہ کی جائے اور جنسی و شہوانی تذکرے سے پرہیز کیا جائے - یہاں گفتگو شرم و غیرت کے اسی مفہوم پر ہو گی اور اسی جذبے کے تقاضے عصمت و عفت سے ملے ہوے ہیں -

ماہرین فن کہتے ہیں کہ فرد کے بعض اہم جذبات کی بنیاد خواہش بقاے قوم پر ہے، اور بعض اہم جذبات خواہش بقاے نسل سے ماخوذ ہیں - لیکن یہ شعبہ کردار انسانی کا ایسا ہے جس کا ربط و تعلق دونوں سے یکساں ہے - جذبۂ بقاے قوم سے بھی اور جذبۂ بقاے نسل سے بھی اور اس لیے اس کی اہمیت بالکل ظاہر ہے -

سب سے پہلے تو اصلاح اس عام اور عالمگیر غلطی کی

ہونی چاہیے کہ جماعتی زندگی کی اکائی فرد ہے۔ جماعتی زندگی کی بنیاد فرد سے نہیں، خاندان سے پڑی۔ اور اس کی اکائی فرد نہیں خاندان ہے۔ خاندان کے ایک رکن کا جو دوسرے رکن سے ربط و تعلق ہوتا ہے، وہی سنگ بنیاد ہے جماعت اور افراد جماعت کے درمیان ربط و تعلق کا۔ جماعت کی جو قدیم سے قدیم تاریخ موجود ہے، اس میں اس کا پتا خاندان ہی کی حیثیت سے چلتا ہے۔ شروع شروع جب انسان کی لڑائی ہر وقت اس کے پاس کے جنگلی جانوروں سے رہا کرتی تھی، اور رات دن اُسے موسم کی سختیوں اور ہوا، بارش، دھوپ، کی ستم رانیوں سے پناہ لینے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی تو ایک دوسرے کی امداد، نصرت، دستگیری، شرکت، ناگزیر تھی۔ اور امداد باہمی کے یہ سارے زینے خاندان والوں ہی کے واسطے سے طے ہوا کرتے تھے۔ باپ بیٹے کو سہارا دیتا تھا، بیٹا باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا، بھائی بھائی سے مل جل کر کام کرتا تھا۔ تو غرض یہ کہ، قومی ہمدردی، وطنی ہمدردی، ملکی ہمدردی، جتنی قسم کی بھی ہمدردیاں آگے چل کر قائم ہوئیں۔ ان سب سے مقدم اور ان سب کا ماخذ و مرجع یہی خاندانی ہمدردی ہے۔

خاندانی وحدت کو توڑ دینے والے، لڑائی کے گھر، ایک مشہور مثل کے مطابق یہ تین ہیں۔ "زر" "زمین" "زن"۔ "زر" تو ابتدائے تمدن میں ہوتا ہی نہیں۔ اس لیے اس پر جھگڑے کا وہاں کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ رہی زمین یا جائداد غیر منقولہ، تو وہ خاندان میں مشترک رہتی ہے۔ اس لیے

اس سے بھی کوئی جھگڑے فساد نہیں اُٹھتے - اب لے دے کے مسئلہ "زن" کا رہ جاتا ہے تو عورت کے معاملے میں رشک و رقابت کی روک تھام کی ممکن صورتیں دو ہیں - ایک یہ کہ شوہر ہر وقت مسلط رہے اور عورت کو برابر اپنی نگرانی میں لیے رہے - دوسری یہ کہ عورت آپ اپنی نگہبان ہو جائے - اور پہرہ دار اپنی عصمت کو بنا لے - لیکن پہلی صورت میں مرد کی حیثیت اِفادی خاندان اور قبیلے کے لیے بہت ہی گھٹتی جاتی ہے - اور اس کے لیے وقت اور قوت کا بڑا حصہ بجائے مفید اجتماعی مشغلوں کے اسی نگہبانی کے نذر ہوا جاتا ہے - لامحالہ کار زار حیات میں کامیابی انہیں خاندانوں اور قبیلوں کو حاصل رہی جن کی عورتوں نے خود عصمت کی انتہائی اہمیت محسوس کر لی' اور اپنی آپ نگہبان ہو گئی تھیں - دوسرے قبیلے جن کی عورتیں اس دولت سے محروم تھیں' وہاں یہ فرض مردوں کو اپنے اوپر لینا پڑا' اور وہ قبیلے قدرتاً جہد زندگی میں پچھڑ کر رفتہ رفتہ مٹ گئے ——— اسی احساس عصمت کا نام شرم و حیا' ہے -

عورت میں اپنی عصمت کا احساس ایک حد تک طبعی و فطری ہے - جیسا کہ بعض جانوروں کی ماداؤں میں بھی ہوتا ہے - لیکن اس درجہ قوی نہیں کہ جماعت اس طبعی احساس کو اپنی ضرورتوں کے لیے کافی سمجھ لیتی - اُسے اس کو کار زار حیات میں اپنے لیے نہایت مفید اور ضروری پا کر اس کو خوب کسنے اور قوی کرنے کی ضرورت تھی - اس کے لیے اس

نے اسے سخت بداخلاقی اور جماعت کی نظر میں ایک شدید و مکروہ جرم بھی قرار دیا، کہ جو عورت اس کی خلاف ورزی کی مرتکب ہو وہ سوسائٹی میں بدنامی بھی پوری طرح اُٹھائے۔ ہر طرح ذلیل و رسوا بھی ہو، اور دوسری طرف اگر قبیلہ عدالت سازی کی حد تک مہذب و متمدن ہو چکا ہے۔ تو اُسے سنگین قانونی جرم بھی قرار دے کر اُسے سخت‌ترین سزاؤں (قتل تک) کا مستوجب ٹھرایا۔ لیکن اس دھرے دھرے بلکہ تہرے، تہرے انتظام سے بھی جماعت کے مطالبات کی تسکین نہ ہوئی۔ اس نے مذہب کی امداد بھی لی۔ اور اِسے ایک بدترین قسم کا مذہبی گناہ بھی قرار دیا ——— نسل انسانی کے تجربے سے معلوم ہوا کہ بقائے قوم و بقائے نسل میں اس جذبۂ عصمت کی اہمیت بہت ہی زاید ہے۔

علم‌الاقوام کے ماہروں نے خبر دی ہے کہ فلاں فلاں وحشی قبیلوں میں بےعصمتی صرف شادی شدہ عورتوں کے لیے جرم ہے۔ بن بیاہیوں کے لیے عیب یا جرم نہیں۔ لیکن نسلی تجربہ اس پر بھی گواہ ہے کہ یہ تفریق عرصۂ دراز تک نہ چل سکی۔ یا تو بن‌بیاہیوں کو بھی بیاہیوں کی صف میں آ جانا، اور انہیں کا قانون اپنے لیے بھی عائد کرنا پڑا، اور جہاں یہ نہیں ہوا، وہاں مردوں کے باہمی رشک و رقابت سے خود اُن قبیلوں ہی کی زندگی ختم ہو گئی، اور وہ کارزار حیات میں دوسرے قبیلوں کے مقابلے میں ناکام رہ گئے ——— یہیں سے یہ عقدہ بھی حل ہوا جاتا ہے کہ دنیا کی نظر میں مرد کی بدچلنی اتنی معیوب کیوں نہیں، جتنی عورت کی۔

مذھب و اخلاق سے یہاں بحث نہیں، یہاں گفتگو صرف نفسیات بشری کے ماتحت ھو رھی ھے - تو نسلی تجربہ یہ ھے کہ بقاے جماعت کے حق میں مرد کی بدچلنی اتنی زاید مضر نہیں، جتنی عورت کی ھے - اور اسی نے نفسیات بشری پر گہرا اثر ڈال کر ایک کو دوسرے کے مقابلے میں معیوب‌تر، مکروہ تر، مبغوض‌تر بنا دیا ھے - مرد مرد، کی رقابت کہیں زیادہ خوں‌ریز اور قبیلے کی وحدت شکن ھے - بہ مقابلہ عورت عورت کی رقابت کے -

———

احساس عصمت اپنی عملی شکل یک‌زوجی میں تو جانوروں کی بھی بعض قسم میں پایا جاتا ھے لیکن اس سے جو جذبہ شرم و غیرت کا وجود میں آتا ھے، وہ شاید نوع انسانی ھی کے ساتھ مخصوص ھے - جانوروں میں اس کا پتا نہیں چلتا - اور انسان کی ھر نسل، ھر قوم، ھر قبیلے میں اس کا وجود کسی نہ کسی حد تک پایا جاتا ھے -

اس شرم و حیا کا لب لباب کیا ھے؟ اِفناء و سعی اِفناء، جنسیت و شہوانیت، بلکہ ان کے متعلقات پر، بعید متعلقات پر بھی پردہ ڈالے رھنا، انھیں دوسرے دوسرے ناموں سے یاد کرنا - انھیں تصریح کے بجاے دور، دور کے اشاروں کنایوں میں چھپانا ——— بعض ماھرین نے یہاں ایک قاعدہ بیان کیا ھے کہ اعمال بشری، اختیاری میں جو عمل بقاے حیات و بقاے نسل کے لیے اھم‌ترین و مقدم‌ترین ھے، وھی سب سے زیادہ چھپا کر کیا جاتا ھے - اور اُسی پر سب سے زیادہ پردے پڑے رھتے ھیں -

عملی زندگی میں جذبۂ شرم و حیا کے تقاضے یوں پورے ہوتے ہیں کہ سب سے پہلے عورت کے اعضائے جنسی کو کامل طور پر چھپا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اعضائے جنسی ثانوی کا نمبر آتا ہے۔ اور عورت کے لیے محرم (انگیا) کے نام سے کپڑا وجود میں آتا ہے۔ ہر جماعت کی تہذیب میں جوں جوں ارتقاء ہوتا جاتا ہے عورت کی ناف، کمر، رانیں، شکم، پشت، دور دور کے اعضاء بھی نظروں سے مخفی کر دیے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ نوبت اس کے سارے جسم کی آ جاتی ہے۔ شرم و حیا کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا مظہر یہی جسم اور اعضائے جسم کو چھپانا ہے۔ اس کے بعد پھر مرتبہ تحریر، تقریر، چال ڈھال، وضع و طریق کا آتا ہے۔ حیاداری کے معنی یہ ہیں۔ کہ کسی قول و فعل سے بھی اُن چھپی ہوئی چیزوں کا اظہار یا اُن کی جانب اشارہ نہ ہونے پائے۔ اور اس احتیاط و اہتمام میں جس قدر کمی آتی جائے گی۔ اُسی مناسبت سے قدم بےحیائی بےغیرتی کی طرف بڑھتے جائیں گے۔

حیا کوئی مخصوص نسوانی جذبہ نہیں۔ بشری جذبہ ہے۔ عورت و مرد دونوں جنسیں اس میں شریک ہیں۔ البتہ عورت چونکہ عمل زوجیت میں، محض ایک انفعالی یا مفعولی حیثیت رکھتی ہے، جس پر اس کے قویٰ کی ساخت اور ترکیب گواہ ہے۔ اس لیے اس کی طبعی حیاداری کا درجہ بھی اسی مناسبت سے بہت بڑھا ہوتا ہے۔ مرد اس کے برعکس فاعلانہ و عاملانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے قدرتاً اس کی حیاداری

اس درجے کی نہیں ہوتی ------ البتہ جہاں کہیں تمدن کی رفتار ارتقاء اس فطری ترتیب ہی کو اُلٹ دیتی ہے - اور عورت کے ذہن پر مساوات کامل کا عقیدہ تسلط جما لیتا ہے، وہاں یہ قیدیں بھی ٹوٹ جاتی ہیں - اور عورت اپنے دعوئے ہمسری کو ثابت کرنے کی دھن میں، بےلباسی عریانی، اور بےحیائی میں مرد سے پیچھے نہیں رہتی، آگے نکل جاتی ہے -

---

بارھواں باب

کمسن مجرم

بمبئی شہر جانے کا کبھی اتفاق ہوا ہو تو اور عدالتوں کے علاوہ وہاں ایک بچوں کی عدالت (Juvenile Court) نظر آئے گی، جس کا حاکم کوئی مرد نہیں بلکہ عورت ملے گی - ان لیڈی مجسٹریٹ کے پاس، کوئی قانونی لازمی ڈگری نہیں بلکہ یہ سائکالوجی (نفسیات) میں ڈاکٹر کی سند رکھتی ہیں - سال بھر ان کے سامنے ۱۶ سال سے کم عمر کے ہزارہا لڑکوں اور لڑکیوں کے مقدمے پیش ہوتے رہتے ہیں - اور جرم کہنا چاہیے کہ سبھی طرح کے ہوتے ہیں - چوری اور جیب کترائی سے لے کر، عصمت، عفت پر، حملہ کرنے تک -

بچے بجائے عام عدالتوں میں لے جائے جانے کے، جرم کرنے کی علت میں یہیں لائے جاتے ہیں - تو وجہ کیا؟ وجہ یہ کہ بچہ ابھی پوری طرح اپنے عمل کا ذمہ دار کہاں ہوا ہے - پوری حس اخلاقی اس کی ابھی بیدار کب ہوئی ہے - دنیا میں قدم رکھتے اور ہوش کی آنکھ کھلتے ہی کچھ تو وہ موروثی اثرات، اپنے ماں باپ، دادا وغیرہ سے ورثے میں لے کر آتا ہے - اور کچھ اپنے ارد گرد کی فضا سے بھائی بہنوں سے، ساتھ کھیلنے والوں اور والیوں سے اخذ کرتا ہے - حق و ناحق، عدل و ظلم، ایمانداری اور بے ایمانی کا شعور پوری طرح بیدار ہوتے

وقت لیتا ھے اور ابھی اس کی عمر یہاں تک پہنچی نہیں - اس لیے بجاے اس کے کہ اُسے جیل میں تھونس کر عادی اور پیشہور مجرموں کی صحبت میں ڈال کر اس کی عادتوں کو زیادہ بگاڑ دیا جائے، مناسب یہ سمجھا گیا کہ ایک بہتر ماحول میں رکھ کر اُس کی عادتوں کی اصلاح کی کوشش کر دیکھی جاے - اور بجاے قید و بند کی کڑی سختیوں کے اس پر تجربہ اصلاح کے نرم چارہ کا کیا جائے ——— سزا اور اصلاح کی راھیں ایک حد تک الگ الگ ھیں - اور مجرم جب تک کمسن ھے - اصلاح کی گنجائش اس کے لیے زیادہ باقی ھے -

———

لڑکا ادھر عدالت میں پکڑ کر آیا - اُدھر ریمانڈ ھوم (Remand Home) میں جو ایک طرح کی حوالات ھے - مقفل کر دیا گیا - اور اس کا معاملہ ایک پروبیشن افیسر (امتحانی حاکم) کے سپرد کر دیا گیا - اب لڑکے کا طبی معائنہ بھی کرا دیا جاتا ھے - اور نفسیاتی معائنہ بھی، کہ دیکھا جائے کہ اس کے جسم یا نفس میں آخر کیا نقص رہ گئے ھیں، جس سے وہ قدم جرم کی راہ کی طرف رکھنے لگا - یہ امتحانات ختم ھوئے، تو پروبیشن افیسر نے خود اس کا بیان کیا - اور اس کی داستان جرم تاریخ جرم کے ساتھ اس کی زبان سے سنی، یہ ھو لیا تو اب ملاقاتیں اور گفتگوئیں، اس کے رشتہداروں سے، دوستوں سے، کھیل اور پڑھائی کے ساتھیوں سے، پڑوسیوں سے - اور تفتیش اس کے شوق و رغبت کی چیزوں اور اس

کے ذوق و تفریح کے رمزوں کی بابت شروع ہوئی - غرض یہ کہ ہر ایسے گوشے کو چھانا گیا - جہاں سے اس کے جرم کے جراثیم پر کچھ بھی روشنی پڑ سکتی ہے - یہ سب مرحلے طے ہو لیے اور اسباب جرم کی تشخیص ہو لی تو اب اُن اسباب کے دفعیے کی فکر ہوئی - مجسٹریٹ اور پروبیشن افیسر دونوں مل کر یہ فیصلہ کرتے ہیں - کہ مجرم کا یا تو طبی یا نفسیاتی علاج کیا جائے - اور یا اُسے پروبیشن آفیسر کی نگرانی میں ایک خاص انسٹیٹیوشن میں رکھ دیا جائے -

خیر یہ تو بچکانی علالت کا تفصیلی بیان شروع ہو گیا - ہمارے آپ کے کام کی چیز یہ نہیں - بلکہ یہ ہے کہ بچہ آخر مجرم بن کیوں جاتا ہے ؟ اور اُسے اس راہ سے باز رکھنے کے کیا کیا طور طریقے ہیں ؟

جرم کی حقیقت نفسیاتی حیثیت سے، صرف اس قدر ہے - کہ وہ ایک جماعت‌شکن عملی ہے - یعنی ایسا عمل جس کی زد آکر اقوام اجتماعی پر پڑتی ہے - تو بچہ اگر مجرم ہے تو اس کے معنی صاف یہ ہیں کہ فطرت سلیم کو چھوڑ کر وہ ایسے محرکات میں پھنس گیا ہے، جو اُسے جماعت شکن افعال کی طرف ابھارتے اور اکساتے آئے ہیں - اور اس کی انسانیت کے نشوونما کی راہ میں مخل ہو رہے ہیں - لیکن خود فطرت سلیم کیا ہے ؟ نفسیین اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ سلیم‌الفطرت بچے کے دل میں خواہشیں یہ چار موجود رہتی ہیں -

(۱) نمو کی خواہش -

(۲) امن و سلامتی کی خواہش
(۳) دوسروں کی نظر میں مقبولیت کی خواہش
(۴) نئے نئے تجربوں کی خواہش

بچے کی ان چاروں فطری خواہشوں کو اگر مناسب غذا ملتی رہی، تو بچے کی بالیدگی بھی صحیح، تندرست معتدل طریقہ پر ہوتی رہتی ہے - لیکن بنیادی خواہشوں کی تسکین میں اگر کہیں پھیر پڑ گیا، تو بچہ ان خواہشوں کی تسکین کا کوئی نہ کوئی غلط اور الٹا راستہ اور ڈھونڈھ نکالے گا - اور یہیں سے اس کی شخصیت اور معاشرے کے درمیان نقیض اور تضاد کی بنیاد پڑ جائے گی -

بچے کی صحت کی نگہداشت کا اگر پورا انتظام نہیں تو بچہ قدرۃ بیمار زیادہ رہے گا - اور محسوس کرے گا کہ اس کی خواہش نمو میں خلل پڑ رہا ہے - چڑچڑاہٹ اور جھنجھلاہٹ اس میں زیادہ پیدا ہو جائے گی - اور غصہ میں آکر بڑی بڑی بے جا حرکتیں کرنے لگے گا ------ جرم کی طرف لے جانے والی اس مثال میں اس کی خواہش نمو سے مزاحمت ہوئی -

ایک اور بچہ ہے کہ وہ مارا پیٹا بہت جاتا ہے - اور اس کے دل میں استادوں کی یا والدین کی ہیبت بہت زیادہ بیٹھ گئی ہے - یا اُسے کھانے پینے کو بہت کم ملتا ہے یا اُسے بھوت، پریت وغیرہ وہمی قوتوں سے ڈرا بہت زیادہ دیا گیا ہے، ایسا کہ وہ اپنے گردوپیش کسی کو اپنا دوست، مخلص اور ہوا خواہ نہیں پاتا تو قدرۃ وہ بھی معاشرت کی طرف سے

بے پروا ہو کر اس سے جنگ کی ٹھان لیتا ہے ـــــــ

مثال میں بچے نے اپنی بنیادی خواہش امن و سلامتی کے ساتھ اپنے ماحول کا تصادم پایا - اور اس لیے لامحالہ متاثر ہو کر مخالفت کی روش پر پڑے گا -

ایک تیسرا بچہ ہے کہ اس کے ماں باپ مر چکے ہیں - اور کوئی اس یتیم کی خاطر نہیں کرتا - وہ بہت ہی غریب اور سوسائٹی کے نزدیک ایک حقیر و ذلیل قسم کے ماں باپ کا لڑکا ہے، جس کی کوئی بات تک نہیں پوچھتا ہے یا اس بیچارے میں کوئی خلقی نقص ایسا ہے جس کی بنا پر ہر طرف ہنسا جاتا ہے، بنایا جاتا ہے، اور اس کی وقعت کسی کی بھی نظر میں نہیں - ایسی سب صورتوں میں جب معاشرہ اُسے مردود و رسوا کیے ہوئے ہے - وہ بھی طبعی طور پر معاشرے سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے - اور بے تحاشے کوئی نہ کوئی جرم کر بیٹھتا ہے -

چوتھی مثال میں ایسا بچہ فرض کیجیے - جس کی نگہداشت، دیکھ بھال ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے - وہ اپنی خواہش اور مرضی سے نہ کھیل کود سکتا ہے - نہ کھا پی سکتا ہے - نہ کسی سے مل جل سکتا ہے - اس کی ہر ہر حرکت پر پابندی عائد - اس کے ہر اقدام پر کوئی نہ کوئی نگرانی حائل - تو وہ بھی اپنے کو معاشرے کے خلاف بغاوت پر مجبور پائے گا - اور کسی نہ کسی مجرمانہ کارروائی میں حصہ لینے لگے گا ـــــــ بچہ بہر حال اپنے لیے نئے نئے تجربوں کی آزادی چاہتا ہے -

ان چار شقوں میں سے ہر شق بچے کو جرائم پیشگی کی طرف جھونک دینے کے لیے کافی ہے - چہ جائیکہ جب کسی کے لیے ان میں سے دو، دو، تین تین، چار چار شقیں اکٹھی ہو جائیں ——— ماہر نفسیات کا کام یہ ہے کہ وہ اس کی تحقیق و تفتیش کرے کہ جو مجرم لڑکا یا لڑکی اس کے سامنے ہے، اس کے لیے ان اسباب میں سے کون سا سبب کس درجے میں اور کس صورت سے پیش آیا - سبب تشخیص ہو جانے کے بعد پھر علاج زیادہ دشوار نہیں رہ جاتا -

———

خوشحال اور امیر گھرانوں میں دیکھا ہوگا کہ گھر کے کام کاج کے لیے، اندر باہر آنے جانے کے لیے لڑکے بھی دس دس، بارہ بارہ برس، کے ملازم رہتے ہیں - یہ ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں - کہ گھر میں اچھے سے اچھے کھانے پک رہے ہیں - اور کھائے جا رہے ہیں - ان کی خوشبوئیں ہی منہ میں پانی بھر لانے کے لیے کافی ہیں - اُن کے آقاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے تک انھیں خوب سیر ہو ہو کر کھاتے ہیں، اور جب کھانا نہیں کھایا جاتا - تو اُن حلووں اور مٹھائیوں کو، کیک اور بسکٹوں کو، دودھ اور بالائی کو، شیرمال اور بریانی کو، وہ زمین پر پھینک پھینک دیتے ہیں - پیروں سے کچلنے اور ملنے دلنے لگتے ہیں - اور اِن بیچارے نوکروں چاکروں کی زبانوں تک ان نعمتوں کا حصہ بھی نہیں آنے پاتا - ایسے حالات میں یہ صبر کہاں تک کرسکتے ہیں - ان میں سے اکثر افراد چھپا کر کھانا پینا شروع کر دیتے ہیں - اور چند روز میں چوری کی بھی

عادت پختہ ہو جاتی ہے ——— بچکانے جرائم کی ایک چلی ہوئی شکل یہ بھی ہے۔

یکے والوں میں۔ تانگے والوں میں۔ ہوٹل کے بیروں میں۔ ریل اور جہاز کے قلیوں اور خلاصیوں میں۔ پولیس اور فوج کے رنگروٹوں میں۔ بعض دفعہ بہت کم سن لڑکے بھی داخل ہو جاتے ہیں۔ اچھے قسم کی تعلیم و تربیت کچھ ہوتی نہیں، ساتھ ہر وقت پوری مردانہ قوت رکھنے والے مردوں کا، جو بیویوں کو ترسے ہوئے ہوتے ہیں۔ ادھر ان چھوکروں کو پیسے کی ضرورت، نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ لڑکے اکثر ان بڑے مردوں کی قوت شہوانی کے تختۂ مشق بن جاتے ہیں۔ اور یا کہیں اس کے برعکس ہوتا ہے کہ بڑوں کی بدچلنیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر، یہ کمسن لڑکے بھی قبل از وقت عورت کے شوق اور پھیر میں پڑ جاتے ہیں۔ اور گھٹیا قسم کی فاحشہ عورتوں کے، پاس جا جا کر، حرام کاری کے اخلاقی جرم، اور سوزاک و آتشک وغیرہ کے جسمانی روگ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں تو خیر، لیکن بڑے اور گنجان مردانی آبادی کے شہروں میں، یہ بلا بڑی کثرت سے پھیلی ہوئی ہے۔ بمبئی کے ایک ریمانڈ ہوم کے اعداد سے معلوم ہوا کہ اس کی آبادی میں لڑکے ۲۵ فیصدی اور لڑکیاں ۳۵ فی صدی کی تعداد میں آتشک میں گرفتار ہیں ——— بچکانے مجرموں کی ایک قسم یہ بھی ہوئی۔

لڑکوں کی آوارگی کی ایک عمومی صورت یہ بھی ہے کہ گھر پر پڑھانے لکھانے میں سختی زیادہ ہوئی شفقت کے بجائے،

ماں باپ نے یا استادوں نے سختی سے زیادہ کام لیا - ان سے اس کی برداشت نہ ہوئی - گھر چھوڑ نکل کھڑے ہوئے - دیہات سے بھاگ کسی بڑے شہر میں پہنچے - وہاں جرائم کے پرورش گاہوں کی کیا کمی ' گرہ کٹوں' اوباشوں' نشہ بازوں' خفیہ فروشوں' دلالوں کی کسی ٹولی کے ہتھے چڑھ گئے - انہوں نے بھانپ لیا کہ یہ تو ہمارے کام کا ہے - یہ ان کی شاگردی میں رہ کر چند روز میں خود جرائم کے مدرسے میں استاد ہو گئے ——— بھگوڑوں' آوارہ گردوں' خانہ بدوشوں کی تعداد اچھی خاصی' جرائم پیشہ کم سنوں کی آبادی میں ملے گی -

بچوں میں (شیرخواری کا زمانہ کسی حد تک مستثنیٰ کر کے) حس ملال و حیا خاصا ہوتا ہے اور سن کے ہر سال بلکہ ہر مہینے کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے - انھیں سزا اگر واجبی دی جائے - یعنی ایسے موقعوں پر جب ان کا جرم خود ان کی نظر میں ثابت ہو جائے تو انھیں سزا دینے والے سے ملال زیادہ نہیں ہوگا - لیکن اگر کسی استاد یا آقا یا والدین نے انھیں خواہ مخواہ سزا دے دی ہے تو ان کے دلوں میں رنجش اور ناگواری پیدا ہو جانا یقینی ہے - چند مرتبہ کے بعد یہ ناگواری' جڑ پکڑ جائے گی اور لڑکا معاشرے کے خلاف بغاوت پر تل جائے گا - اور اس کی اِس بغاوت ہی کے کسی نہ کسی شکل میں ظہور کا نام جرم ہے ——— تو بچے کو اگر جرائم پیشگی سے پاک و صاف رکھنا ہے - تو لازمی ہے کہ اس کے ساتھ انصاف کا برتاؤ رکھا جائے - اور اُسے یہ احساس نہ ہونے پائے کہ میرے ساتھ زیادتی کی جا رہی

ہے - اس میں اتنی جرأت ابھی نہیں کہ وہ کھل کر اپنے بڑوں اور بالادستوں کے خلاف سنائے - لیکن وہ معاشرے کے قانون توڑنے یا بہ الفاظ دیگر جرم کرنے کی فکر میں شعوری یا لاشعوری طور پر ضرور پڑ جائے گی -

بچے کی جبلت جستجو پسند ہوتی ہے - دنیا کی چھوٹی، بڑی ہر چیز اس کے لیے عجوبہ ہے - اس کا ماحول اس کے لیے پورا عجائب خانہ ہے - وہ ہر چیز کو، چھو کر، دیکھ کر، توڑ کر، جوڑ کر، پکڑ کر، مروڑ کر، یا کم از کم پوچھ کر جاننا چاہتا ہے - یہ اس کا تجربہ کرنا چاہتا ہے - اس راہ میں اگر بار بار رکاوٹیں پیش آئیں گی - اور اس کی اس جبلت کو بغاوت کی طرف لے جائیں گی ——— بچوں کو گونگا بہرا بنائے رکھنا ہرگز ان کے حق میں دوستی نہیں ہے - اور نہ یہ کوئی نمونہ اچھی تربیت کا ہے -

بچوں میں جنگ جوئی بھی پھیلی ہوئی ہے - جسم میں نئی نئی آئی ہوئی قوتیں اپنے صرف و استعمال کا بہانہ ڈھونڈتی رہتی ہیں - باہم لڑنے جھگڑنے کے علاوہ بچہ جو نقلی بادشاہ یا فوجی جنرل بن کر ایک دوسرے پر کرتے رہتے ہیں - کھیل میں ایک دوسرے کے خلاف فوج کشی و صف آرائی کرتے رہتے ہیں - یہ سب اُسی صفت کے مظہر ہیں - یہ کھیل کی جنگ و جدل بڑی حد تک فطری تقاضۂ جنگ کی قائم مقامی کر دیتی اور اصلی جنگ و جدل سے بچائے رکھتی ہے -

تیرھواں باب
اشتہارات

نان کوآپریشن (ترک موالات) اور خلافت کی تحریک اور زور شور کا زمانہ آپ کو یاد ھے؟ وھی کوئی سنہ ۱۹۲۰ ع ۱۹۲۱ ع کا - ھزاروں دکانوں پر دیکھتے کیا ھیں' کہ جاپان کی آئی ھوئی نئی نئی دیاسلائیوں کی ڈبیاں رکھی ھوئی ھیں - اور ان پر تصویر گاندھی جی کی بنی ھوئی! ——— گاندھی جی بیچارے کو آخر سگریٹ سے دیاسلائی سے کیا تعلق؟ واسطہ اس سے ھو یا نہ ھو ھندستان کی پبلک سے تو واسطہ تھا - اور بہت زیادہ تھا - اُن کا نام پجتا تھا' ان کا نام بکتا تھا - ان کی مورت ایک قیمتی مال تجارت تھی - ان کی تصویر بجائے خود ایک مالیت تھی ——— جاپان کے تاجروں نے اس راز کو پا لیا - اور گاندھی جی کی تصویر کو ایک درشنی ھنڈی بنالی' گاندھی دیاسلائیاں خوب بکیں -

نقسیات کا فن اشتہارات کے کام کا ھے یا نھیں' اس پر توسرے سے کسی بحث و گفتگو کی ضرورت ھی نہیں' اچھے اچھے اشتہارنویس ھر ملک و قوم کے اب اِسے سمجھ گئے ھیں اور اس کی اھمیت و ضرورت پر سب متفق ھو گئے ھیں - بحثیں صرف اُن تفصیلات سے متعلق رہ گئی ھیں کہ زمین کس رنگ کی ھو اور حاشیہ کس رنگ کا؟ سائز پوسٹر کے لیے

کون سا مناسب ہوگا؟ اور ہینڈبل کے لیے کون سا، دلوں پر اثر ڈالنے والا ہوگا؟ خط عنوانات اور سرخیوں کا کیا رکھا جائے اور اصل عبارت کا کیا، جو جاذب توجہ زیادہ سے زیادہ بن سکے؟ سادہ کاغذ زیادہ دلکش رہے گا یا رنگین کاغذ؟ تصویر اگر دی جائے تو اشتہار کے شروع میں یا آخر میں یا درمیان میں؟ اشتہار میں مال کے کس وصف پر سب سے زیادہ زور دیا جائے؟ آیا اس کے مفید ہونے پر یا اس کے ارزاں ہونے پر، یا اس کے دیرپا اور پائدار ہونے پر؟ ——————

یہ اور اسی قسم کے بیسیوں دوسرے سوالات کا جواب کسی چھوٹی سی کتاب کا ایک چھوٹا سا باب کہاں تک دے سکتا ہے؟ یہاں تو صرف چند سوال طبیعت میں کرید پیدا کرنے کے لیے نمونے کے طور پر درج کر دیے گئے۔ جوابات کچھ تھوڑے بہت عرض کر دیے جائیں گے۔ اور جتنے بتائے جائیں گے؟ اس سے کہیں زیادہ صاحب فہم ناظرین خود اپنی فہم و ذہانت سے نکال لیں گے۔

پہلے دو ایک موٹے موٹے اصول اہل فن کی زبان سے سن لیجیے۔ شاخیں ان کی بہت سی از خود نکل آئیں گی۔

———

(۱) ذہن ایک ہی وقت میں اور فوراً کئی کئی چیزوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

اس لیے کھلی ہوئی بات ہے کہ معمولی سائز کے اشتہار

کی سرخی کسی لمبی چوڑی عبارت کو بنانا غلطی ھے - اشتہاری سرخی کی عبارت ھمیشہ مختصر، گٹھی ھوئی اور جاذب نظر ھونا چاھیے - کوشش مشتہر کی یہ ھونا چاھیے کہ جس کسی راہ گیر کی نظر سرسری اور اچٹتی ھوئی محض اتفاق سے بھی جس اشتہار پر پڑ جائے، تو بس اس کی سرخی پر جم کر رہ جائے - ایک ھی نظر میں اس کے دل میں اتر جائے - اور اس کا شوق اسے خود مجبور کر دے کہ وہ آگے کی عبارت پڑھنے لگے -

اخبارات کی لمبی لمبی، کئی سطروں کی سرخیوں پر اشتہارات کی سرخی کو ھرگز قیاس نہ کیا جائے - اخبار تو انسان لیتا ھی اس ارادے اور خواھش سے ھے کہ وہ اسے پڑھے گا - اور ممکن ھے کہ شروع سے آخر تک پڑھے - اس لیے طولانی سرخیاں اس کے مطالعے میں حائل نہیں - بہ خلاف اس کے اشتہار تو راہ گیر اپنے قصد اور خواھش سے نہیں دیکھنا چاھتا (سوا اس کے کہ کہیں وقت کاٹنا ھی اس مشغلے سے منظور ھو) یہ کام تو اشتہار نویس ھی کا ھے کہ عنوان میں ایسی دلچسپی اور کشش رکھ دے کہ نظر اگر محض اتفاق سے بھی اشتہار کی سرخی پر پڑ جائے تو اب دل کا اشتیاق بغیر آگے بڑھے اور پورا اشتہار پڑھے نہ رھے!

(۲) ذھن، ادق، خشک و مغلق الفاظ کی طرف سے بھاگتا اور سلیس شگفتہ مانوس عبارت کی طرف دوڑتا ھے -

اشتہار کی سرخی میں بڑے بڑے موٹے الفاظ نہ لائیے، عنوان ھمیشہ سبک، سادے، سلیس، عام فہم، دلکش الفاظ کو

بتائیے ــــــ اشتہار' یاد رکھیے کہ اپنے آپ کو پڑھواتا ہے' کوئی خود سے اُسے پڑھتا نہیں ہے۔

(۳) ذہن انسانی تکرار محض سے اچاٹ ہو جاتا ہے' تکرار مع التنوع سے الفت محسوس کرتا ہے - ایک ہی اشتہار یعنی ایک ہی لفظ و عبارت کے ساتھ ایک ہی پرچے میں' ایک ہی جگہ' بلا ناغہ لگاتار چھاپتے جانا' ذہن کو اس کی طرف سے بےتوجہ کر دیتا ہے - تکرار و اعادہ یقیناً ایک بڑی مفید و موثر چیز ہے - لیکن اسی وقت جب تک اس سے اکتاہٹ نہ پیدا ہو جائے - تکرار محض کے اسی اثر سے بچنے کے لیے تنوع کی آمیزش لازمی ہے - اس لیے:-

(الف) وہی اشتہار یا تو کچھ کچھ وقفے کے بعد نکلے (یہ زمان میں تنوع ہوا)

(ب) وہی اشتہار مختلف پرچوں میں نکلے (یہ مکان میں تنوع ہوا)

(ج) وہی اشتہار کا مضمون ادل بدل کر نکلا کرے (یہ اصل شے میں تنوع ہوا)

ضمناً ایک دوسری چیز بھی اسی قانون سے نکل آئی - مختصر' دوسطری' چارسطری عبارتوں میں تو خیر زیادہ نہیں' لیکن لمبے اشتہاروں میں عبارت کی طرح کتابت کی' قلم کی یکسانی بھی مضر ہوگی - لمبے اشتہار کی تاثیر کا ایک بڑا گر یہ ہے کہ:-

(۱) خط' ضروری الفاظ کا جلی اور خوب روشن ہو اور بقیہ کم ضروری الفاظ کا خفی -

(۳) سطریں سب یکساں لمبائی کی نہ ہوں بعض جگہ آدھی سطر پوری سطر سے بہتر رہے گی -

---

(۴) ہر رنگ بجائے خود اور دوسرے رنگ کے ساتھ ترکیب میں ایک خاص درجہ قوت اور تاثیر کا رکھتا ہے -

اسٹیشنوں اور سڑکوں کے بورڈ کے پتھر اگر سفید یا ہلکے بادامی رنگ کے ہوں تو اُن پر سیاہ رنگ کے حروف زیادہ نمایاں ہوں گے - بہ مقابلہ اس کے کہ حروف سفید رنگ کے ہوں' اور بورڈ سیاہ رنگ کا - اسی طرح جو مشتہر کاغذ کی سیاہ زمین میں سفید حروف رکھتا ہے وہ غلطی کرتا ہے - نمایاں کرنا ہے تو اشتہار کے کاغذ کی زمین سفید ہی رکھنا چاہیے اور حروف سیاہ -

---

(۵) جلب توجہ کا بڑا ذریعہ ندرت ہے' اور اس کا استعمال سب سے زیادہ عنوان ہی میں ہو سکتا ہے -

اپنی طالب علمی کا زمانہ تھا کہ لکھنؤ میں ایک صاحب نے کھانے کا تمباکو (زردہ و قوام وغیرہ) کا کارخانہ کھولا - اشتہار کثرت سے دیا اور عنوان رکھا :-

"شہنشاہ جہانگیر اور ہم"

عنوان اتنا دلکش اور جاذب نظر تھا کہ ہر شخص کی نظر پڑتے ہی جم جاتی - اور اضطراراً آگے کا مضمون پڑھنے لگتی - آگے مضمون یہ تھا کہ اگر شہنشاہ جہانگیر کا احسان دنیا پر یہ ہے کہ اُس نے تمباکو کی پتی کا رواج دیا' تو ہمارا احسان دنیا پر یہ ہے کہ ہم نے تمباکو کو خوش ذائقہ اور لطیف کر کے

نفاست پسند طبقہ کے قابل کر دیا -

ستمبر سنہ ۱۹۱۵ع میں ایک عظیم‌الشان سیلاب آیا، معاً لکھنئو کی ایک گراموفون کمپنی نے اشتہار دیا -

" بھیا آ گئی "

لوگ چلتے چلتے ٹھٹھک جاتے اور دیواروں پر اشتہار کو پڑھنے لگتے، مضمون یہ تھا کہ ہمارے پاس سامان گراموفون کی بھیا آ گئی - ایک دوسرے اشتہار کا عنوان تھا،

" گورنر بگڑ گیا "

یہ بھی اچھا خاصا جاذب نظر ثابت ہوا، لوگ قدرتاً گورنر سے صوبے کا اعلیٰ‌ترین حاکم مراد سمجھے، حالانکہ مشتہر کی مراد، گراموفون مشین کے اس پرزے سے تھی، جسے گورنر کہتے ہیں -

---

(۶) لیکن جدت عنوان، اور "غرابت" میں بہت فرق ہے - غرابت دل‌کشی کی ضد ہے -

بعض مشتہرین جدت و ندرت کی تلاش میں غلطی سے اتنی دور چلے جاتے ہیں کہ دل‌کشی کے حدود سے بالکل باہر نکل کر اجنبیت و غرابت کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں ——— "نیا پن" اور انوکھاپن، دو بالکل مختلف بالکل متضاد کیفیتوں کے نام ہیں -

حلوے، شربت، مربے، بسکٹ، میں مینڈھک کی تصویر بنا دینا - اچھی اچھی کتابوں کے اشتہار پر، بچھو کی تصویر

رکھ دیتا - راهگیر کا دل کھینچنے کے بجاے اور اُسے هٹا دیتا هے اور مال کے ساتھ خوش‌گوار تلازم ذهنی پیدا کرنے کے بجاے اُلٹا اس کے ساتھ افتراق ذهنی اور تنافر طبعی پیدا کر دیتا هے -

(۷) عنوان پر تصویر ایسی هو جو مال کے لیے شوق و دل‌چسپی پیدا کر سکے - نه که بجاے خود مقصود بن جائے -

ایک بار ایک موٹرفروش کارخانه نے اپنے هاں کے موٹروں کا اشتہار دیا - اور ایک نوجوان حسینه کی تصویر بنائی جو بڑے ذوق و شوق سے کھڑی هوئی موٹر کو دیکھ رهی اور مسکراتے هوئے چہرے کے ساتھ اُس پر هاتھ پھیر رهی تھی ——— مشتہر کا کھلا هوا مقصد یه تھا که لوگ اس نوجوان حسینه کی تصویر پر ضرور هی نظر ڈالیں گے اور اس طرح کارخانے کے مال کو بھی دیکھ لیں گے - هوا اِس کے برعکس - یعنی لوگوں کی نظریں ذوق و شوق سے پڑیں ضرور، لیکن کارخانے کے مال پر نهیں، بلکه تمام‌تر حسینه کے حسن و جمال پر - مشتہر کے پاس خطوط کی ڈاک بندھ گئی، لیکن ذکر مال کا کسی میں نهیں، استفسار سب اسی حسینه کے نام و پتے سے متعلق تھے !

(۸) عنوان یا تصویر ایسی هو، جو مضمون اشتہار سے قریبی تعلق یا واسطه رکھتی هو، تعلق بہت دور کا اور واسطه افتراق پیدا کرنے والا نه هو -

ایک انگریزی پرچے میں توتھ پیسٹ یا منجن کا اشتہار پورے صفحے کا نظر آیا - صفحے کے بائیں رخ پر تصویر زنانی

پنڈلیوں کی گھٹنیوں سے نیچے تک کی تھی - اور اوپر لمبے نازک موزے چڑھے ہوئے دکھائے گئے تھے، عبارت اشتہار کی طول طویل تھی - خلاصۂ مضمون یہ تھا، کہ ہمارا منجن نہایت ارزاں ہے - اس سے جو روپیہ بچے گا - اُسی سے دوسرے سامان خریدے جا سکتے ہیں - اور ان سامانوں میں خاص طور پر، خوش گوار زنانے پیر کے لیے یہ نرم و نازک، آرام دہ پاتابے ہیں ——— اب اتنا دماغ کسے کہ ان درمیانی مقدمات کو بھی ذہن میں رکھے - اور اتنا سوچ ساچ کر - اس نتیجے تک پہنچے - خریدار کے لیے اپیل بالکل براہ راست اور بلاواسطہ ہونا چاہیے -

اشتہار کا اصل کام یہ ہے کہ مال کی بھوک ناظرین کے دل میں پیدا کر دے -

———

"چند اچھے اشتہارات کے نمونے"

(۱) ایک کھانسی کی انگریزی گولیوں کا اشتہار دیکھنے میں آیا - اوپر جلی سرخی کہ نزلے و زکام کو ابھی رخصت کیجیے - داہنی طرف ایک جوان حسین عورت کی تصویر، جو رومال ہاتھ میں لیے، کھلے ہوئے منہ، پھیلی ہوئی آنکھیں اور پیشانی پر شکنوں کے ساتھ کھانسی کی تکلیف میں مبتلا دکھائی گئی ہے - بائیں طرف شستہ عبارت میں دوا کے مفید، خوش ذائقہ اور زود اثر ہونے کا ذکر، اور نیچے دوا کا نام بہت جلی خط میں، اور دوا کی شیشی اور کاغذی ڈبیا کی تصویر -

(۲) ایک کارخانۂ چرم سازی کا اشتہار - اوپر کے حصے

میں ایک ہوائی جہاز کی تصویر جو زمین سے عنقریب اُڑنے کو ہے - سامنے ایک بڑا بکس جو کسی مسافر کا سامان سفر ہے - پاس ہی ایک سپاہی وردی میں ملبوس جہاز کے زینے کے آگے راستہ روک کر کھڑا ہوا ہے اور بکس کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا ہے کہ اتنا بڑا بےھنگم بکس لے جانے کی اجازت نہیں - نیچے عبارت میں یہ مضمون کہ ہوائی سفر کے لیے موزوں و مناسب، ہلکے اور آرام دہ اور گنجائش اور خوشنما چرمی بکس ہمارے کارخانے نے بنائے ہیں -

(۳) ایک بچوں کے لیے انگریزی مصنوعی دودھ کے اشتہار پر نظر پڑی، اوپر جلی عنوان "خوش نصیب ماں" معاً نیچے ایک نوجوان خوبصورت عورت کی تصویر جو بہت ہی مطمئن اور بشاش چہرے کے ساتھ اپنے تندرست سوتے ہوئے بچے کے چہرے کو اپنے ہونٹوں سے لگائے ہوئے ہے - اس کے نیچے یہ مضمون کہ بچوں کی زندگی کا پہلا سال بہت ہی اہم ہوتا ہے - اسے خوش، چاق، تندرست رکھنے کا بہترین نسخہ ہمارے کارخانے کا مصنوعی دودھ ہے -

---

چودھواں باب
عامل و معمول

بچپن میں سنا تھا کہ سوتے وقت اپنے ہمزاد سے یہ کہدو، کہ فلاں وقت اُٹھا دینا تو اس وقت آنکھ کھل جاتی ہے - اور ہمزاد جگا دیتا ہے' - سننے کے بعد اس پر عمل بھی کیا' واقعی بارہا تجربہ صحیح نکلا' اور بڑے ہوئے تو سنا کوئی نقش بھی تسخیر ہمزاد کا ہوتا ہے' اور سیکڑوں ہزاروں انسان اپنی مرادوں کے پورے کرنے کے شوق میں یہ نقش دام خرچ کر کرکے خریدتے رہتے ہیں ——— عوام میں چلے ہوئے اور پھیلے ہوئے اعتقادات عام طور پر بالکل بے بنیاد نہیں ہوتے - کوئی نہ کوئی اصل ان کی ہوتی ضرور ہے - البتہ عوام اپنی کج فہمی اور نادانی سے اس کی حقیقت کو بالکل مسخ کر دیتے ہیں -

یہی بات یہاں بھی ہے - یہ ہمزاد صاحب وہی ہیں جنھیں نفسیات کے ماہرین اپنی اصطلاح میں تحت الشعور یا شعور خفی کہتے ہیں - یہ تحت الشعور یا غیر شعوری نفس بڑے کام کی چیز ہے - بڑا کارگزار' بڑا طاقت ور' اور خطرناک امکانات سے لبریز' یہ اگر سدھ جائے اور قوت ارادی کے قابو میں آ جائے تو اس سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں - ایسے کہ جو بہ ظاہر ناممکن معلوم ہوتے ہیں -

اس کا کام غور و فکر، بحث و استدلال نہیں - اس میں طبعی صلاحیت اطاعت و خدمت‌گذاری کی ھے - اسے جو کچھ حکم دیجیے یہ اسے کرنے لگے گا - چاھے یہ غیر شعوری نفس خود اپنا ھی ھو، چاھے کسی دوسرے کا - صرف سلیقہ اس سے کام لینے اور اسے حکم دینے کا ھونا چاھیے - یہ تاثر، یہ انفعال، یہ قبول و اطاعت کی صلاحیت اس کی طبعی خاصیت ھے ------ آپ نے دیکھا نہیں کہ نادان بیمار پرسی کرنے والے جاکر مریض کے سامنے کہہ آتے ھیں "افوہ تم تو بہت ھی دبلے ھو گئے ھو، بالکل زرد" اور مریض کا تحت‌الشعور جو پہلے ھی سے کمزور ھوچکا ھوتا ھے - اس کلمے سے متاثر ھوکر، مرض سے مقابلے و مدافعت میں اور کمزور پڑ جاتا ھے - اور مرض اس پر اور زیادہ غالب آنے لگتا ھے - بہ‌خلاف اس کے صاحب‌فہم دوست جب مریض سے یہ کہتا ھے - کہ ماشاءاللہ دوا کارگر ھو رھی ھے - انشاءاللہ جلد ھی اچھے ھو جاؤ گے، تو مریض کا تحت‌الشعور مرض سے مقابلے و مقاومت میں دگنی قوت حاصل کر لیتا ھے - اور مریض واقعی تندرست ھونا شروع ھو جاتا ھے -

کہیں کہیں جو ایسے مشورہ بےاثر رھتے ھیں یا ان کا الٹا اثر ھوتا ھے، تو اس کا سبب یہ ھوتا ھے کہ نفس میں مشورہ دینے والے کی طرف سے یقین یا اعتماد کسی درجے میں بھی نہیں ھوتا، اور وہ الٹا اس کی مخالفت پر آمادہ ھو جاتا ھے -

تجربہ‌کاروں اور نفس بشری کے رازشناسوں نے

تحت الشعور کی اس طبعی خاصیت کو پہچان کرکے اس سے خوب خوب کام لیے ہیں اور اس کا ایک مستقل فن بنا لیا ہے۔ اصطلاح میں اس عمل کا نام عمل تنویم یا ہپناٹزم ہے۔ تنویم مادۂ نوم سے ماخوذ ہے۔ اور نوم عربی میں نیند کو کہتے ہیں۔ اس عمل میں بھی چونکہ معمول کو ایک قسم کی مصنوعی نیند آ جاتی ہے۔ اس لیے اس پر بھی نیند ہی کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور اسے تنویم کہا جانے لگا۔

اس فن کی جھلکیاں اور اشارے تمام قدیم تہذیبوں کے نوشتوں میں ملتے ہیں۔ بابل، مصر، ہند، ایران، یونان، چین کوئی بھی ان تذکروں سے خالی نہیں۔ مسلمان عاملوں کا فن حاضرات اسی سے ملتی ہوئی، فن کی ایک ادنیٰ قسم اور مسلمان درویشوں کی توجہ، فن کی ایک اعلیٰ قسم ہے۔ لیکن یورپ میں اس فن کی ابتدا جرمنی کے ڈاکٹر مسمر کے تجربوں سے اٹھارویں صدی کے آخر میں ہوئی ہے۔ چنانچہ شروع شروع فن کا نام بھی بانیٔ فن کے نام پر مسمریزم رہا۔ آدھی صدی کے بعد انگلستان میں ایک ڈاکٹر جیمس بیرڈ نمودار ہوئے۔ انھوں نے ۱۸۴۱ء میں اپنی تحقیق سے اس فن کو نسبتاً باضابطہ مدون کیا۔ اور اس وقت سے اس کا نام ہپناٹزم پڑا۔ بعد کو بڑے بڑے ماہرین فن نفسیات نے اپنی اپنی تحقیق اور موشگافیوں سے فن کو معتبر اور مستند بنا دیا۔ اور اسے عزت کے ساتھ نفسیات کی علمی کتابوں میں جگہ ملنے لگی۔

ممکن ہے کہ آپ نے کسی مشہور بازیگر یا ہپناٹسٹ

کو فن کے کرتب دکھاتے ہوئے دیکھا ہو - اس وقت اس کے کمالات پر آپ یقیناً حیران رہ گئے ہوں گے - بہ ظاہر عامل، معمول پر بالکل حاکم و آمر ہوتا ہے اور معمول گویا اس کی مٹھی میں ایک بےجان آلے کی حیثیت رکھتا ہے - خیر پیشہ‌ور عاملوں کا تو پیشہ اور ذریعۂ رزق بھی یہی ہے - لیکن پیشے سے قطع نظر یوں بھی ہپناٹزم کے اثرات حیرت انگیز ہی ہیں - بیمار اس سے اچھے ہوسکتے ہیں - درد اس کی مدد سے سلب ہو سکتا ہے - مریض کو نیند اس سے آ سکتی ہے - اخلاقی اصلاحیں اس کے توسط سے ممکن ہیں - مجرم جرائم کا اقرار اس کے ذریعے سے کرسکتے ہیں - چھپے ہوئے راز اس کے ذریعے سے ظاہر ہوسکتے ہیں - اور خود جرائم کا ارتکاب بھی اس سے کرایا جا سکتا ہے - گویا ہر شکار کے لیے ایک کارآمد تتی !-

---

تنویم کا طریقہ آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو تصور کی آنکھ کے سامنے عامل اور معمول کو لائیے، دیکھیے کمرے میں تنہائی ہے - اگر زیادہ لوگ ہوں گے، تو معمول کی توجہ بٹتی رہے گی - اور توجہ میں یکسوئی مشکل ہی سے پیدا ہوسکے گی - عامل نے معمول کو کرسی یا فرش پر بٹھا دیا - یا پلنگ یا آرام کرسی پر لٹا دیا - سر بہر صورت تکیے وغیرہ کی مدد سے ذرا اونچا رہے تو بہتر ہے - عامل گفتگو ایسی کرتا جا رہا ہے - کہ معمول کے دل میں اس کی جگہ پیدا ہو - معمول اس سے وحشت، دہشت، ہراس یا بدگمانی نہ محسوس کرے - بلکہ

اس سے متعلق اطمینان اعتقاد و رکھے، اب عامل جیب سے کوئی چھوٹی چمکدار چیز نکالتا ھے، مثلاً انگوٹھی، بٹن، یا بجلی کا بچکانہ قمقمہ، اور خود کھڑے ہو کر یا بیٹھے ہوئے اُسے پیچھے کی طرف سے معمول کی آنکھ کے سامنے اور اس کی سطح سے ذرا اوپر پیشانی کے محاذ میں کوئی چھ سات انچ کے فاصلے پر لاتا ھے۔ (ذرا اوپر کی قید اس لیے کہ معمول کو اپنے پپوٹے اٹھانے پڑیں تاکہ آنکھیں جلد تھکن اور جلد نیند کی طرف مائل ہو جائیں) عامل اب اس چھوٹی چمکدار چیز کو آہستہ آہستہ دائرے کی شکل میں حرکت دے رہا ھے اور معمول کو تاکید کر رہا ھے کہ نظر برابر اسی مرکز توجہ پر جمی رہے۔ عامل اُدھر تو معمول کی آنکھوں کو تھکا کر اُنھیں بند ہونے پر لا رہا ھے۔ اِدھر زبان سے پرزور، اور یقینی، لیکن نرم لہجے میں معمول سے زبانی بھی کہتا جا رہا ھے کہ دیکھو اب تمھارے پپوٹے بھاری ہو چلے، وہ دیکھو تمھیں نیند آنے لگی، تمھاری آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ اب سانس گہری ہوگئی۔ نیند آ گئی، آنکھیں بند ہو گئیں، بالکل بند ہو گئیں، اب تم سو گئے، ہاں بالکل سو گئے۔ نیند خوب گہری آ گئی، خوب غفلت کی آ گئی۔

معمول اب واقعی سو جائے گا اور اس کا تحت الشعور تمام تر عامل کا محکوم ہو جائے گا۔ سردی کے موسم میں عامل اس سے کہے گا کہ "اس وقت گرمی ھے، خوب گرمی پڑ رہی ھے، تمھیں کپڑے ناگوار ہو رہے ہیں۔ خوب گرمی لگ رہی ھے۔ پسینہ آ چلا، تمھیں خوب پسینہ آنے لگا"۔ اس پر معمول کے

واقعی پسینہ چلنے لگے گا اور وہ حالت غفلت میں پوری طرح گرمی محسوس کرے گا - اسی طرح گرمی کے موسم میں عامل اس سے کہے گا کہ "اس وقت سردی ہے، کیسی سردی ہے - ہوا کیسی ٹھنڈی چل رہی ہے، تم جڑا رہے ہو، وہ لو تم کانپنے لگے، سردی سے تمہارے دانت بجنے لگے" - اور واقعتاً معمول سخت سردی محسوس کرنے لگے گا - سردی سے کانپے گا بھی اور دانت بھی اس کے بجیں گے - اس طرح عامل جو کیفیت چاہے گا اپنی مرضی اور ارادے کے مطابق اس پر طاری کر دے گا - اور پھر کیف اس وقت تک طاری رہے گی جب تک عامل خود ہی اس کے دور کرنے کا حکم نہ دے، اوو معمول سے یہ نہ کہے کہ "اچھا اب تمہاری نیند ختم ہوتی ہے - اب تم جاگتے ہو، اچھا اب جاگ جاؤ، اور آنکھیں کھول دو" - اس پر معمولی جاگ پڑے گا اور ہوشیار ہو جائے گا -

میں جب بی ' اے میں تعلیم پا رہا تھا تو سائیکالوجی کی کتابیں پڑھ پڑھ کر، ازخود ہپناٹزم کا شوق ہوگیا تھا - اور بغیر کسی استاد کے سیکھے، محض ڈاکٹر مول [۱] وغیرہ کی کتابوں کی مدد سے میں نے یہ عمل شروع کر دیا تھا - شروع میں خود ایک عرصے تک پلک جھپکائے بغیر، نظر جمائے رکھنے کی مشق کی تھی، اور اس کے بعد چمکدار بٹن کی مدد سے

---

[۱] جرمنی کا مشہور ماہر فن ڈاکٹر البرٹ مول (Moll) جس کی ضخیم کتاب اس فن پر (Contemporary Science Series) میں شامل ہے - اور بہ قول امریکی محقق ولیم جیمس کے اپنے موضوع پر بہترین و مستندترین کتاب ہے -

یہ توجہ دینی شروع کردی تھی - ذاتی تجربے سے معلوم ہوا کہ کمسن لڑکے سب سے زیادہ آسانی سے معمول بن سکتے ہیں - اس کے بعد عورتوں کا نمبر آتا ہے اور سب سے آخر میں معمر مردوں کا' اور یہی بیان ماہرین فن کا بھی ہے - میں نے معمول کو ہنسانے اور رلانے کی بھی مشق کسی قدر بہم پہنچائی تھی - اور تھوڑا بہت علاج بھی کرنے لگا تھا - قبض کے مریض' بخار کے مریض' درد سر کے مریض' درد شکم کے مریض' بارہا اچھے ہو گئے - اور ایک بار کامیاب تجربہ وجع مفاصل کی بھی نوعمر مریضہ پر ہوا "تم اچھی ہو' اب بالکل اچھی ہو' درد گیا' بالکل جاتا رہا' اب درد کا نام و نشان نہیں' بالکل اچھی ہو' اب آنکھیں کھول دو" اِدھر یہ افسوں پڑھا جاتا رہا اور مریضہ کی ایک بزرگ عزیزہ میری حسب ہدایت مریضہ کے مقام درد پر اوپر سے نیچے ہاتھ پھیرتی رہیں - اور اُدھر مریضہ نے آنکھیں کھول دیں - وہ واقعتاً اپنے کو تندرست ہی محسوس کر رہی تھیں اور دو منٹ کے اندر شدید درد کے دور کردینے والے مسیحا کو دیکھ رہی تھیں حیرانی اور شکرگزاری دونوں کی ملی جلی نظروں سے !

مشق اور بڑھی' بعض مجرموں سے اُن کے ہلکے ہلکے جرائم کے اقرار کرا لیے' اور اس کے بعد شوق اس کا ہوا کہ معمول کو غیب‌داں بھی بنایا جائے - ٹائم پیس گھڑی اس کی بند آنکھوں اور کانوں کے قریب پیشانی کے محاذ میں لاکر سوالات ماہرانہ لب و لہجہ کے ساتھ ہونے لگے کہ "بتاؤ گھڑی میں وقت کیا ہے ؟ صحیح وقت کیا ہے' تم گھڑی دیکھ رہے ہو' ہاں' دیکھ رہے ہو'

ہاں اب چھوٹی سوئی بھی دیکھ رہے ہو، ٹھیک ٹھیک دیکھ رہے ہو، بتاؤ ٹھیک ٹھیک بتاؤ، ہاں کیا بتایا ہے، ٹھیک بتایا گھنٹے کی سوئی خوب ٹھیک دیکھ لی، اب چھوٹی سوئی دیکھ کر منٹ بھی بتاؤ، شاباش، قریب آ گئے ہو، بہت قریب آ گئے ہو، واہ ارے ابکی تو بالکل ٹھیک بتا دیا"۔

مشق کی نوبت ابھی یہیں تک آئی تھی - اور معمول نے کچھ کچھ صحیح جوابات دینے شروع کئے تھے کہ خود عامل کی توجہ اُدھر سے ہٹ کر، دوسرے مشغلوں کی طرف ہو گئی - مشق ناتمام رہی اور اس کے بعد کی مشقیں بالکل ہی کوری رہ گئیں - مثلاً یہ کہ بتاؤ کلکتے میں اس وقت کیا ہو رہا ہے؟ تم کلکتے پہنچ گئے ہو، بڑے بازار میں کھڑے ہوئے ہو، کچھ دیکھ رہے ہو، اچھی طرح دیکھ رہے ہو، بتاؤ کیا ہو رہا ہے دکانیں کھلی ہوئی ہیں، خوب مجمع ہے - موٹر چل رہے ہیں - ہاں ہاں صاف صاف بتاؤ - اور کیا دیکھ رہے ہو"- وغیرہ وغیرہ، اپنی مشقیں تو بس یہیں تک رہیں، لیکن کتابوں میں پڑھا، اور بچپن میں خود بھی تماشا دیکھا کہ پیشہ ور عامل نے معمول کا جسم بالکل کڑا کر دیا اور رفتہ رفتہ اُسے بےسہارے کر کے، ہوا میں گویا بالکل معلق چھوڑ دیا -

اس تصرف کی کامیابی میں بڑا دخل معمول کے اعتقاد اور قوت خیال کو ہے - وہ اگر عامل کا معتقد ہے - تو کامیابی جلد ظاہر ہو سکتی ہے - لیکن اگر وہ منکر ہے - اور قصداً مزاحمت و مقاومت کر رہا ہے - تو وہ متاثر نہ ہو گا - اور عامل ناکام رہے گا - بشرطیکہ معمول میں ضعف ارادہ کے

باعث خود ھی تذبذب و تزلزل نہ پیدا ھو جائے - اعتقاد کی قوت علاوہ اس عمل ھپناٹزم کے یوں بھی نفس تحت الشعور پر گہرا اثر ڈالتی رھتی ھے - اور جو چیزیں اصلاً غیر موثر ھیں انھیں موثر بناتی رھتی ھے - دو پرانے طبیبوں کا قصہ غالباً پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ طب عربی میں لکھا ھے - کہ دونوں میں مقابلہ اس پر ھوا کہ دیکھیں کون زیادہ تیز اور قطعی زھر ایجاد کر سکتا ھے - ایک طبیب نے گولیاں یا سفوف پیش کیا - دوسرے طبیب نے اُسے حلق سے اُتار کر تریاق کا استعمال کر لیا - اور اچھا ھو گیا، اب دوسرے طبیب کی باری آئی - اُس نے ایک سونگھنے والی دوا پیش کی - اور دعوے کے ساتھ کہا کہ اس کو سونگھتے ھی مر جاؤ گے - پہلے طبیب پر ایسی وحشت طاری ھوئی کہ اُسے سونگھتے ھی وہ واقعتاً مرگیا، حالانکہ اس دوا میں کچھ بھی سمیت نہ تھی -

حیدرآباد کے مشہور ڈاکٹر لفٹننٹ کرنل اشرف الحق دھلوی مرحوم ایک قصہ اپنا بیان کرتے تھے - کہ دکن کے ایک جاگیردار صاحب کی والدہ اور اُن کی لڑکی دونوں میرے زیر علاج تھیں - دوائیں دونوں کو ایک ساتھ دی گئیں - دوا کھلانے والی تیماردار کی غفلت سے دوائیں بدل گئیں، یعنی دادی صاحبہ کی دوا پوتی کو اور پوتی کی دوا دادی صاحبہ کو ملتی رھی - ایک کو ھچکی کی شکایت تھی دوسری کو ایک قسم کے قولنج کی - دواؤں کی اس الٹ پلٹ کے بعد جب دوسری بار اُن کے ھاں گیا تو دونوں مریض اچھے تھے - یہ نفع جو کچھ

بھی ہوا محض اعتقاد سے ہوا' اس وقت اگر میں کہیں یہ غلطی کر بیٹھتا کہ دواؤں کے ادل بدل کا چلا اُٹھتا اور مریضوں کو خبر کر دیتا' کہ انھیں غلط دوائیں ملی ہیں - تو عجب نہیں کہ وہ سارا فائدہ جو انھیں حاصل ہوا' خاک میں مل جاتا ——— مذہب نے تو دعاؤں تک میں یقین و اعتقاد کی قوت کو' بہت موثر و کارگر مانا ہے - نفسیاتی پہلو اِس کا ظاہر ہے کہ پختہ اعتقاد کے ساتھ دعا مانگنے والے کو خود قوت‌قلب یا خوداعتمادی بہت کچھ حاصل ہو جاتی ہے - اور اس سے بہت بگڑے ہوئے کام بن جاتے ہیں - اور بہت سی مشکلات سلجھ جاتی ہیں -

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ معمول عامل کے ہاتھ میں مردہ بدست زندہ ہوتا ہے - وہ جو چاہے اُس سے کہلا لے' کرا لے' لیکن اس دعوے کو کلیہ کی صورت میں نہ لینا چاہیے' ماہرین کہتے ہیں کہ تحت‌الشعور کے بھی تاثر و انفعالیت کی ایک حد ہوتی ہے - اس حد سے آگے جانے سے تحت‌الشعور عموماً انکار کر دیتا ہے - البتہ ہر نفس غیرشعوری کے لیے ہر نفس‌شعوری ہی کی طرح اس کے حدود الگ الگ ہوتے ہیں - اور اس کا دارومدار' ماحول' طبیعت اور فطری رجحان طبیعت پر ہے - کسی گہرے مذہبی شخص سے ایسے کلمات کا ادا کرانا جسے وہ اپنے عقیدے میں کفر سمجھ رہا ہے' حالت تنویم میں بھی دشوار ہے - کسی شریف آبرودار خاتون سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عامل کے حکم پر مجمع عام میں اپنا لباس اُتار دے گی خام خیالی ہے - کسی اوسط درجے کے اور معمولی سیرت و کردار رکھنے والے کو عامل

اگر حکم دے کہ وہ جاکر چھرے سے فلاں شخص کو بے گناہ قتل کر آئے - تو اِس حکم کی تعمیل نہ ہو سکے گی - ایسے تمام موقعوں پر تحت الشعور کو ایک دھکا سا لگے گا اور معمول بجائے اس کے کہ ایسے اخلاق سوز احکام کی تعمیل کرے خود حالت خواب سے بیدار ہوجائے گا ———— تنویم سے بیدار کرنے کے لیے' ہوش میں لے آنے کے لیے - دماغی دھکے بھی اُسی طرح کارگر ہو سکتے ہیں جس طرح مادی اور جسمانی دھکے' زور کا شور غل' زور سے جسم کو جھنجھوڑ دینا وغیرہ -

عام قانون یہی ھے لیکن بعض استثنائی صورتیں ایسی بھی فن کی کتابوں میں درج ہیں کہ معمول' تنویم کی انتہائی غفلت اور بےہوشی میں ایسے اخلاق سوز احکام کی تعمیل اور جرائم بھی کر گزرا ھے - ایسی صورتوں میں یا تو عامل غیر معمولی قوت ارادی اور صرف توجہ کا مالک ہوتا ھے - اور یا معمول غیرمعمولی ضعف ارادہ اور شدت تاثر کا شکار ———— جسمانیات و مادیات کی طرح نفسیات کا بھی کوئی قانون ایسا نہیں جو استثناء سے مستثنیٰ ہو -

آخر میں ایک بات اور - اور وہ بھی زیادہ تر ذاتی تجربے پر مبنی - کسی کو شوقیہ اور بلا ضرورت معمول بہت زاید اور بار بار نہ بنائیے - اِس سے اس کے دماغ پر اثر پڑ جاتا ھے - مصنوعی نیند اور بےہوشی کی غیر طبعی کیفیتیں کوئی تفریح کا مشغلہ نہیں کہ کثرت سے محض تفریح کے لیے طاری کی جاتی رہیں -

———

ضمیمہ (۱)

فہرست اشخاص

(اُن مغربی مصنفین کے نام انگریزی میں جن کا ذکر اس
کتاب کے صفحات میں آیا ھے)

1. Aristotle.
2. Bain.
3. Baird.
4. Baldwin.
5. Brett.
6. Browne.
7. Burke.
8. Darwin.
9. Fechner.
10. Hall (Stanley)
11. Hamilton (William)
12. Helmholtz.
13. Herbart.
14. Hobbes.
15. Hume.
6. James (William)
17. Lange.
18. Leibnitz.
19. Lewes (G. H.)
20. Lotze.
21. MacDougall.
22. Mesmer.
23. Mill (James)
24. Muller (Johannes)
25. Munsterberg.
26 Plato.
27. Plotinus.
28. Ribot.
29. Schopenhauer.
30. Spencer.
31. Stout.
32. Sully.
33. Teteus.
34. Titchener.
35. Ward.
3 . Weber.
37. Wundt.

————

ضمیمہ (۲)

فہرست اِصطلاحات فن

احساس	Feeling
اختلال	Disorder
اخلاقی	Moral
اخلاقیاتی	Ethical
اِدراک	Perception
اِدّراک	Apperception
ارادہ	Will
ارادی	Voluntary
اِستحضار	Reproduction, Representation
استحضاری	Reproductive, Representative
اضطراری	Reflex
اعصاب حرکی	Motor nerves
اعصاب حسی	Sensory nerves
اعصاب برآور	Efferent nerves
اعصاب درآور	Afferent nerves
اکتسابی	Acquired
آلہ	Organ
الہیات	Metaphysics
الہیاتی	Metaphysical
امتیاز	Discrimination
انضباط	Discipline
ائتلاف	Association
بصارت	Sight
بصری	Optical
تجرید	Abstraction
تحت الشعور	Subconsciousness
تحلیل	Analysis
تخیل	Imagination
تذکر	Recollection
تشریح	Anatomy

ument	دلیل
in	دماغ
f	ذات
elligence	ذہانت
ellect	ذہن
ntality	ذہنیت
action	رد عمل
ul pirit	روح
nation	سعی عمل
tom	سالمہ
udition earing	سماعت
nditory	سمعی
onsciousness	شعور
ubcouscious-ness	شعور خفی
Conscious	شعوری
Sexual Emotion	شہوانیت
Conation	طلب
Habit	عادت
Nerve	عصب
Muscle	عضلہ

Conception	تصور
Reasoning nerves	تعقل
Ideation	تفکر
Repetition	تکرار
Concomitance	تلازم
Image	تمثال
Idea	تمثل
Discrimination	تمییز
Current	تہییج
Instinct	جبلت
Instinctive	جبلی
Emotion	جذبہ
Body	جسم
Sense	حاسہ
Muscular feeling	حاسۂ عضلی
Memory	حافظہ
Sensation	حس
Presentative	حضاری
Senses	حواس
Humour	خلط
Will Desire	خواہش

Central	مرکزی	Physiology	عضویات
Temperament	مزاج	Physiological	عضویاتی
Seat	مستقر	Action	عمل
Similarity	مماثلت	Physiology	فعلیات
Disposition	میلان	Automatic	قسری
Spinal Cord	نخاع	Plasticity	لچک
Amnesia	نسیان	Environment	ماحول
Nervous system	نظام عصبی	Matter	مادہ
Mind	نفس	Abstract	مجرد
Psychology	نفسیات	Motive	محرک
Psychological	نفسیاتی	Seat	محل
Psyhologist Psychical	نفسی	Periphery	محیط
		Peripheral	محیطی
Mentality	نفسیت	Cerebrum	مخ
Impression	نقش	Cerebellum	مخیخ
Sentiment	وجدان	Subject	مدرک (بکسر را)
Cognition	وقوف	Object	مدرک (بفتح را)
Cognitious	وقوفی	Centre	مرکز
Impulse	ہیجان		

———

قیمت : دو روپے چار آنے

Printed by : THE VISHVA-VANI PRESS, ALLAHABAD.